پشاور سے قسطنطنیہ تک

ایک پرخطر داستان

سفر نامہ

محمد آصف عادل

بسم الله الرحمن الرحيم

کتاب کا نام	پشاور سے قسطنطنیہ تک
مصنف	محمد آصف عادل
صفحے	۱۸۰
کمپوزنگ اور ڈیزائن	محمد آصف عادل
چھاپ کی جگہ	ابو موسی بک پرنٹنگ لاہور
تعداد	۱۰۰۰
چھاپ کا سال	اکتوبر ۲۰۲۵
قیمت	۲۵۰

فہرست

ان تمام لوگوں کے نام جنہوں نے میری زندگی کے ہر موڑ

پہ میرا ساتھ دیا اور میرا سپورٹ سسٹم بنے رہیں

محض الفاظ نہیں حقیقت

یہ تحریر محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ان تمام نوجوانوں کے لیے ایک دردمندانہ پکار ہے جو روشن مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے غیر قانونی ہجرت یا ڈنکی کے خونی راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ میرا یہ سفر نامہ گواہ ہے کہ یہ راستہ جتنا سہانا ایجنٹوں کی باتوں میں لگتا ہے حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ ہولناک اور وحشت ناک ہے۔ سب سے پہلی بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ ایجنٹ آپ کو انسان نہیں بلکہ رقم کا بنڈل سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے آپ کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ آپ کو شیریں چائے جیسے کوڈ ورڈز دے کر یہ احساس دلاتے ہیں کہ آپ کسی خفیہ مشن پر ہیں لیکن حقیقت میں آپ ایک ایسی دلدل میں قدم رکھ چکے ہوتے ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ صرف معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ آپ کو گڑھوں میں بٹھاتے ہیں جانوروں کی طرح گاڑیوں میں ٹھونستے ہیں اور ذرا سی مخالفت پر خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ میں نے اپنی دکان اور اپنی جمع پونجی اس سفر کی نذر کر دی۔ اکثر لوگ قرض اٹھا کر یا

زمین بیچ کر یہ قدم اٹھاتے ہیں۔ یاد رکھیے اس راستے میں قدم قدم پر آپ کو لوٹا جائے گا۔ کبھی سم کارڈ کے نام پر کبھی پانی کی بوتل کے نام پر اور کبھی خوابگاہ کے کرائے کے نام پر۔ آپ کے پاس موجود اضافی رقم ایجنٹوں کے پالے ہوئے چور چھین لیں گے۔ انجامِ کار آپ نہ صرف جسمانی طور پر معذور یا زخمی ہو جاتے ہیں بلکہ مالی طور پر بھی اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے دوبارہ کھڑا ہونا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ صحرا کی تپتی دھوپ برفیلے پہاڑوں کی ہڈیوں میں اترتی سردی بھوک پیاس اور تنگ نالوں میں دم گھٹنے کا تجربہ ایک ایسی نفسیاتی چوٹ ہے جو عمر بھر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب آپ اپنے سامنے ساتھیوں کو مرتے پٹتے یا ذلیل ہوتے دیکھتے ہیں تو انسانیت پر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ کیا چند ٹکوں کی خاطر اپنی عزتِ نفس کا اس طرح جنازہ نکالنا درست ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا وہاں زندہ رہنے کا اصول خاموشی ہے۔ آپ کو اپنے سامنے ہوتے ظلم پر آواز اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر آپ غیرت مند ہیں اور کسی کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو میری طرح لہولہان کر دیے جائیں گے۔ یہ راستہ

آپ سے آپ کی غیرت اور ضمیر کا سودا مانگتا ہے۔ میرے بھائیو رزقِ حلال کی تلاش عبادت ہے لیکن اپنی جان کو جان بوجھ کر ہلاکت میں ڈالنا گناہ ہے۔ اپنے ملک میں رہ کر محنت کرنا چھوٹا کاروبار کرنا یا قانونی طریقے سے باہر جانے کی کوشش کرنا ہزار درجے بہتر ہے اس ذلت سے جو ایران اور ترکی کے پہاڑوں میں بکھری پڑی ہے۔ جو رقم آپ ایجنٹوں کو دیتے ہیں اسی سے اپنے ملک میں کوئی باعزت کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ یہ راستہ موت کا راستہ ہے۔ اس میں کامیابی کا تناسب بہت کم اور ذلت کا امکان صد فیصد ہے۔ میری تمام والدین اور نوجوانوں سے التجا ہے کہ ایجنٹوں کے سبز باغ دیکھ کر اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگی داؤ پر نہ لگائیں۔ وطن کی مٹی میں سوکھی روٹی کھانا پردیس کے ان خونی صحراؤں میں سسک کر مرنے سے بہتر ہے۔ یہ محض ایک سفر کی روداد نہیں بلکہ ایک ایسی آگ سے واپسی کی کہانی ہے جس میں ہزاروں معصوم زندگیاں خاکستر ہو چکی ہیں۔ میرا مقصد کسی کی ہمت توڑنا نہیں بلکہ اس سراسر خسارے کے سودے سے خبردار کرنا ہے جسے ایجنٹ بڑی خوبصورتی سے روشن مستقبل

بنا کر پیش کرتے ہیں۔اسلام ہمیں رزقِ حلال کے لیے جدوجہد کا حکم دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اپنی جان کی حفاظت کو فرض قرار دیا ہے۔قرآنِ پاک میں واضح ارشاد ہے**اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔ سورۃ البقرہ 195**۔اس غیر قانونی سفر میں جس طرح ہم دم گھٹتے پائپوں سے گزرے تپتے صحراؤں میں پیاس سے تڑپے اور ظالم ایجنٹوں کے تشدد کا نشانہ بنے یہ سب جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ جان اللہ کی امانت ہے اور اس طرح جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا مذہبی طور پر بھی سخت ناپسندیدہ عمل ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ بارڈر پار کرنا ہی آخری منزل ہے حالانکہ اصل مصیبت وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ غیر قانونی سرحد پار کرنے پر آپ بین الاقوامی مجرم بن جاتے ہیں۔اگر آپ پکڑے جائیں تو نہ صرف ملک بدری کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ آپ پر ہمیشہ کے لیے قانونی سفر کے دروازے بند ہو سکتے ہیں۔آپ جن لوگوں کو لاکھوں روپے دیتے ہیں وہ قانونی طور پر انسانی اسمگلر ہیں۔ان کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔ وہ آپ کو بیچ سکتے ہیں آپ کے

اعضاء نکال سکتے ہیں یا آپ کو اغوا کر کے تاوان مانگ سکتے ہیں۔ ترکی اور ایران کے بارڈرز پر جس طرح ہمیں فوجیوں نے ہانکا ہمیں جانوروں کی طرح ایک قطار میں کھڑا کر کے پیٹا گیا وہ لمحہ ایک غیرت مند انسان کے لیے موت سے زیادہ تلخ ہوتا ہے۔ جب آپ واپس خالی ہاتھ اور زخمی بدن کے ساتھ اپنے گھر لوٹتے ہیں تو وہ ذہنی دباؤ اور ندامت آپ کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ میں نے اپنی دکان بیچی کسی نے زمین بیچی ہو گی تو کسی نے زیور۔ وہ لاکھوں روپے جو ہم نے ان درندوں کی جیبوں میں ڈالے اگر وہی رقم ہم اپنے ملک میں کسی چھوٹے ہنر یا کاروبار میں لگاتے تو شاید آج ہم اپنے پیاروں کے درمیان عزت کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ اپنے ملک کی مٹی میں اتنی برکت ضرور ہے کہ اگر ہم اتنی ہی مشقت یہاں کریں جتنی ان پہاڑوں میں کی تو ہم بھوکے نہیں مریں گے۔ میرے بھائیو بیرونِ ملک جانے کا شوق برا نہیں لیکن اسے قانونی راستے سے حاصل کریں۔ اگر آپ کے پاس ہنر ہے تو پوری دنیا آپ کے لیے کھلی ہے۔ لیکن یہ ڈنکی کا راستہ صرف ذلت خون اور آنسوؤں کا راستہ ہے۔ ایجنٹوں

کے جھوٹے وعدوں پر یقین نہ کریں۔ سوشل میڈیا پر دکھائی جانے والی یورپ کی رنگین ویڈیوز کے پیچھے چھپی ان لاشوں کو دیکھیں جو ایران اور ترکی کے پہاڑوں میں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ اپنی ماں کی دعا اور باپ کی چھاؤں کو اس ذلت کے بدلے مت بیچیں۔ خدا کے لیے اس راستے کو ترک کر دیں۔ میں نے جو دیکھا جو سہا اور جو محسوس کیا وہ میں نہیں چاہتا کہ میرا کوئی اور بھائی یا نوجوان محسوس کرے۔ یہ راستہ آپ کو منزل پر نہیں مقتل میں لے جاتا ہے۔ آخر میں میں یہ بات نہایت انکسار کے ساتھ عرض گزار ہوں کہ چونکہ میرا شمار کسی مستند یا مستقل لکھاری کے طور پر نہیں ہوتا اس لیے قوی امکان ہے کہ میرا یہ سفر نامہ گرامر کی اغلاط رموزِ اوقاف کی لغزشوں اور جملہ بندی کی سقم جیسی متعدد خامیوں کی زد میں ہو جس کے لیے میں اپنے قارئین سے پیشگی معذرت کا طلب گار ہوں در حقیقت میرا مقصد اپنی مہارت یا فن کی گہرائی کا اظہار کرنا ہر گز نہیں بلکہ اپنی ذات کی طرح تلاشِ راہ میں بھٹکے ہوئے دوستوں کی محض اصلاح اور رہنمائی کرنا ہے اور میں تہہِ دل سے ان تمام احباب کا بے حد مشکور و

ممنون ہوں جنہوں نے اس ناچیز کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنے قیمتی الفاظ کو میری کتاب کی زینت بنایااور میری اس ادھوری سی کاوش کواپنی گراں قدر آراء سے وہ تقویت بخشی کہ یہ آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آپکاخیر خوا

محمد آصف عادل

یہ میری زندگی کی ایک حقیقی سفر نامہ ہے اور اس کا ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے۔اس سفر نامے کا ہر لمحہ تکلیف اور درد سے بھرا ہوا ہے اور یہ میری زندگی کی تلخ ترین لیکن عبرت ناک یادوں میں سے ایک ہے۔

روانگی اور سفر کا مقصد

چھوٹی عید کے دن میں اپنے پھوپھی زاد بھائی علی خان کے ساتھ پشاور کے بس ٹرمینل سے کوئٹہ بلوچستان کی طرف روانہ ہوا۔ علی خان میری پھوپھی کا بیٹا ہے جس کے والدین وفات پا چکے ہیں اور ہم نے اسے اپنے بچوں کی طرح پالا ہے۔ اس مشکل سفر میں وہ میرا واحد ساتھی تھا۔اس سفر کے پیچھے ایک تلخ حقیقت تھی۔ میں شدید مالی بحران کا شکار تھا اور قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ایک دن میرا ایک دوست جو میری دکان میں ڈیٹا کا کام کرتا تھا اور میرے مالی حالات سے واقف تھا دکان پر آیا اور اس نے بیرون ملک جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے بھی اپنے ارادے کا اظہار کیا لیکن اسے اپنی مجبوری بتائی کہ میرے پاس

اتنے وسائل نہیں ہیں تو وہ ہنسا اور کہنے لگا بھائی دوست کس دن کے لیے ہوتے ہیں؟ وہ صبح سبزی منڈی میں کام کرتا تھا اور دو بجے کے بعد میں نے بغیر کرایے کے اپنی دکان میں اسے ایک کاؤنٹر دیا ہوا تھا جہاں وہ کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے موبائل اور یو-ایس-بی و میموری کارڈ میں ڈیٹا ڈالنے کا کام کرتا تھا۔ اس کی مالی حالت کچھ بہتر تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی دکان فروخت کر دی اور 72,000 بہتر ہزار روپے اس نے مجھے قرضِ حسنہ کے طور پر دیے۔ چونکہ قانونی طور پر جانے کے وسائل نہیں تھے اس لیے ہم نے ڈنکی ایجنٹ کے ذریعے غیر قانونی راستہ لگانے کا فیصلہ کیا۔

ایجنٹ سے رابطہ اور تیاری

ایجنٹ کو تلاش کرنا اور اس ارادے کو عملی جامہ پہنانا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ بہت سے مشوروں اور گھومنے پھرنے کے بعد ہمیں غفار نامی ایک ایجنٹ ملا جو ضلع مردان صوابی کا رہنے والا تھا۔ غفار کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار روپے

میں سودا طے ہوا اور روانگی کے لیے چھوٹی عید کا تیسرا دن مقرر کیا گیا۔ میرے خاندان اور چند قریبی دوستوں کے علاوہ کوئی دوسرا اس سفر کے بارے میں باخبر نہ تھا۔ دوست کے قرضِ حسنہ اور موبائل ریپیئرنگ کی دکان بیچنے سے میں نے سفر کے اخراجات پورے کیے۔ میرا وہ دوسرا دوست اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے رہ گیا لیکن اس نے میری مالی مدد کی جبکہ علی خان کے پیسوں کا بندوبست اس کے چچا نے کیا۔

کوئٹہ تک کا سفر

پشاور سے روانہ ہو کر ہمارا پہلا پڑاؤ درہ آدم خیل میں تھا۔ درہ آدم خیل خیبر پختونخوا کے ضلع کوہاٹ میں واقع ایک تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے اہم قصبہ ہے جو پشاور اور کوہاٹ کے درمیان ایک پہاڑی سلسلے میں واقع ہے اور صدیوں سے اپنی مخصوص روایات اور ثقافت کی وجہ سے پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ یہ علاقہ آفریدی قبائل کی آدم خیل شاخ کا مسکن ہے جس کی بہادری اور مہمان

نوازی کے قصے تاریخ کا حصہ ہیں۔ درہ آدم خیل کی سب سے بڑی شہرت یہاں کی اسلحہ سازی کی صنعت ہے جہاں کاریگر نسل در نسل بغیر کسی جدید مشینری کی مدد کے صرف ہاتھوں اور سادہ اوزاروں کی مدد سے دنیا کے جدید اسلحے کی ہو بہو نقل بنانے کی حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے دنیا کی سب سے بڑی ہاتھ سے بنے اسلحے کی مارکیٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں کی تنگ گلیاں اور بازار اسلحے کی دکانوں سے بھرے ہوئے ہیں جہاں چھوٹی پستول سے لے کر جدید رائفلوں تک بنائی جاتی ہیں جو یہاں کے لوگوں کے روزگار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسلحہ سازی کے علاوہ درہ آدم خیل اپنی دشوار گزار پہاڑی چوٹیوں اور اسٹریٹجک محل وقوع کی وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ کوہاٹ ٹنل کے ذریعے جنوب اور شمال کو جوڑنے کا ایک اہم راستہ فراہم کرتا ہے۔ یہاں کی سماجی زندگی قبائلی روایات جرگہ سسٹم اور خاندانی غیرت کے محور پر گھومتی ہے جہاں آج بھی بزرگوں کے فیصلوں کو اولیت دی جاتی ہے۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں تعلیم اور سماجی ترقی کی طرف توجہ بڑھی ہے اور یہاں کے بہت سے

نوجوان اب مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں لیکن درہ آدم خیل کی پہچان آج بھی وہی لوہا پگھلانے والے کاریگر اور وہ فولادی عزم ہے جو اس درے کی ہواؤں میں بسا ہوا ہے۔ یہ علاقہ نہ صرف ایک تجارتی مرکز ہے بلکہ پشتون قبائلی فن مہارت اور خودداری کی ایک ایسی زندہ مثال ہے جس کی نظیر پوری دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

وہاں سے ہم نے کھانے پینے کا سامان خریدا اور کوہاٹ لاچی کرک اور لکی مروت کے راستے ڈی آئی خان پہنچے۔ وہاں ہم نے مشہور سوہن حلوہ کھایا اور پھر ژوب قلعہ سیف اللہ اور کچلاک کے راستے تقریباً 17 گھنٹے کی مسافت کے بعد کوئٹہ پہنچ گئے۔ راستے میں جگہ جگہ فوج کے چیک پوسٹ تھے جو شناخت پہچان کے بعد ہمیں آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔

موت کے سوداگر

کوئٹہ میں ہم نے ولی اڈے کے قریب ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ کمرہ دو افراد کے لیے تھا یعنی اس میں دو بیڈ موجود تھے کمرہ صاف اور ہوادار تھا اور اس میں ٹیلی ویژن بھی موجود تھا اس کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ روم تھا۔ کل صبح دس بجے تک کے لیے ہم نے اسے تین ہزار کرائے پر لیا۔ رات کے چار بجے غفار کی کال آئی اور اس نے ہمیں موبائل پر دوسرے ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔ ہمیں ایک خفیہ کوڈ دیا گیا شیریں چائے۔ ہمیں تاکید کی گئی کہ صرف اسی کوڈ والے ایجنٹ کے ساتھ جانا ورنہ دوسرے ایجنٹ تمہیں اغوا کر لیں گے بلیک میل کریں گے اور تمہارے مارنے پیٹنے کی ویڈیوز گھر والوں کو بھیج کر ان سے پیسے مانگیں گے۔ اس ایجنٹ کا نام محمد تھا اور وہ قوم کا بلوچ تھا جو ہمیں دالبندین لے گیا اور وہاں ایک ڈھابے میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد ایک لمبے بالوں والا شخص آیا وہ بھی بلوچ تھا اور **مولانا** کے نام سے مشہور تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہمیں ایک دوسرے شخص کے پاس لے گیا راستہ مکمل تاریک تھا اور اس شخص کے پاس کلاشنکوف

اور پستول تھی۔ ہم بہت زیادہ ڈر رہے تھے علی خان مجھے اور میں علی خان کو دیکھ رہا تھا اور دل میں آیت الکرسی کا ورد کر رہے تھے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی راتیں تھیں جو ہم گھر سے باہر گزار رہے تھے۔ ماحول بھی بدلا ہوا تھا تو ڈرنا فطری بات تھی۔

ایجنٹ کے بعد ایجنٹ

مولانا نے ہمیں پھر احمد نامی ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔ احمد ہمیں ایک ویران صحرا میں لے گیا اور زمین میں کھودے گئے ایک گڑھے میں بٹھا دیا۔ گڑھا گہرا تھا لیکن اس میں اترنے کے لیے سیڑھیوں کی شکل میں راستہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں مختیار تمہارے پاس آئے گا۔ جب مختیار آیا تو مرغ کی اذان کا وقت تھا یعنی صبح کی روشنی پھیلنے کی تیاری میں تھی۔ مختیار ہمیں ایک کچے گھر میں لے گیا اور کہا کہ میں تمہارے لیے روٹی کا انتظام کرتا ہوں۔ مختیار بھی بلوچ تھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہا تھا۔ ہم نے بھی سفر اور تھکن کی وجہ سے

بھوک محسوس کی تھی۔ لیکن جب وہ روٹی اور سالن لایا تو روٹی لکڑی کی طرح خشک تھی اور سالن صرف نام کا تھا۔ میں نے اور علی نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا کہ یہاں مہمان کی ایسی مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ بلکہ ہمارے منہ تو تب حیرت سے کھلے رہ گئے جب کھانے کے بعد اس نے ایک وقت کی خشک روٹی کی قیمت 3 ہزار روپے اور کمرے کا کرایہ 5 ہزار روپے فی کس وصول کیا۔ بحث کرنے پر اس نے ہمیں سزا دی اور موبائل بھی ہم سے بند کروا دیے۔ اگلے دن ہم نے روٹی سے انکار کر دیا لیکن کمرے کا کرایہ پھر بھی مار کھا کر دو افراد کا تین ہزار روپے دیا۔ اگلے دن وہ چار پنجابیوں کو اور لائے جن کے نام اس ترتیب سے تھے شہزاد ثقلین چیمہ اور گجر۔ اور دوسرے دن دو اور افراد قاری اور بلال کو لائے۔ شہزاد ثقلین چیمہ اور گجر کا تعلق صوبہ پنجاب کے علاقے وزیر آباد گجرات سے تھا۔ قاری اور بلال کا تعلق صوابی سے تھا۔ اس طرح شیریں چائے گروپ کے ممبران کی تعداد آٹھ ہو گئی۔ ہماری طرح انہیں بھی لوٹا گیا اور یہ سلسلہ دو دن تک جاری رہا۔

بلوچستان کی جھلساتی صحرا

مختیار نے ہمیں ایک بچے کے حوالے کیا جسے وہ راہ بلد راستہ جانے والا کہتے تھے۔ یہ بھیڑوں اور بکریوں کے ایک بڑے ریوڑ کی مانند ایک کاروان تھا جس کا لیڈر وہ بچہ تھا۔ راستے میں دوسرے ایجنٹ موٹر سائیکلوں پر آتے جن کے پیچھے انہوں نے ستلو کی بوریوں سے جھول جو گدھے یا گھوڑے پر لادی جاتی ہے بنائی ہوئی تھی جس میں خشک روٹی لسی پانی بسکٹ اور دیگر ضرورت کا سامان تھا جسے وہ ہم بے بس لوگوں پر ہزار فیصد سے بھی زیادہ منافع پر فروخت کرتے تھے۔ مختیار نے کہا تھا کہ اپنے ساتھ زیادہ پانی لے لو ورنہ پھر نہیں ملے گا اور ایسا ہی تھا۔ غفار کے مطابق پیدل راستہ تقریباً 45 منٹ کا تھا تو ہم نے سوچا کہ 45 منٹ کے لیے دو بوتل پانی کافی ہے۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی کیونکہ راستہ بہت لمبا اور گرمی حد درجے زیادہ تھی اور 15 روپے والی بوتل 1000 روپے میں مل رہی تھی۔ بلکہ وقت گزرنے اور گرمی بڑھنے کے ساتھ وہ اس کی قیمت بھی بڑھا دیتے۔ حشر کا میدان تھا پانی کے لیے لوگ ایک دوسرے

کو ایمان تک دے رہے تھے۔ اف محشر کے دن کیا حال ہو گا۔ یا ربِ کریم ہم بہت خطاکار اور سیاہ کار ہیں اے مالک ہمیں بلا حساب و کتاب جنت کا حقدار بنا دے آمین ثم آمین۔ آخر کار ہمارے پاس پیسوں کی سکت بھی اتنی نہ رہی۔ پیاس بڑھ گئی وجود بوجھ بن گیا اور ایسے حالات آگئے کہ لوگوں نے پاؤں گھسیٹنا شروع کر دیے کوئی کہاں اور کوئی کہاں پیچھے رہ گیا۔

بلوچستان کی جھلساتی ہوئی ریت اور بے رحم سورج میں زندگی کی امیدیں مرجھا رہی تھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم پانچ چھ افراد اپنے کاروان سے بچھڑ کر گم ہو چکے تھے۔ یہ کاروان مختلف گروہوں کا مجموعہ تھا۔ اس گرم صحرا میں دور دور تک دھول کے بگولوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا نہ ہمارے پاس خوراک کا ایک دانہ تھا اور نہ پانی کا ایک قطرہ۔ پیاس کی وجہ سے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے اور میری زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی۔ ہم اتنے بے بس ہو چکے تھے کہ ایک گڑھے میں کھڑے بدبودار اور کیڑوں والے پانی پر ایک دوسرے سے لڑ پڑے اور ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔

اسی حال میں علی خان اور دوسرے ساتھیوں نے مجھے انتہائی ناامیدی کی حالت میں چھوڑا اور آگے نکل گئے کیونکہ مجھ میں مزید چلنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ میں ریت پر اوندھے منہ پڑا تھا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ موت میرے سامنے رقص کر رہی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ آسمان میں گدھوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا اور فضا میں چکر لگانا شروع کر دیے۔ لیکن شاید ابھی میری زندگی باقی تھی علی خان جو آگے گیا تھا اسے ایک قافلہ مل گیا اور وہ کہیں سے پانی کی دو بوتلیں لے آیا۔ اس نے میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور تھوڑا سا پانی مجھے پلایا تاکہ میری سانس بحال ہو سکے۔

آزمائش کا لمحہ

جب میری طبیعت کچھ بحال ہوئی تو ہم نے ایک ایجنٹ کو پانچ ہزار روپے دیے تاکہ وہ ہمیں کسی محفوظ جگہ پہنچا دے۔ اس نے ہمیں ایک موٹر سائیکل کے

پیچھے بٹھایا اور صحرا کے بیچ و بیچ ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں دور دور تک صرف ریت اور آگ برساتا سورج تھا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا یہاں انتظار کرو میں تمہارے لیے گاڑی بھیجتا ہوں۔ گھنٹوں گزر گئے لیکن گاڑی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ بھوک اور پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔ میرا پھوپھی زاد بھائی علی خان جو یتیم تھا ہمت ہار گیا اور بچوں کی طرح اونچی آواز میں رونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے آنسوؤں نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میں نے اسی بے بسی میں اللہ کے دربار میں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں نے زار و قطار فریاد کی ندامت کے آنسو بہائے اور وہیں ریت پر دو رکعت نمازِ حاجت ادا کی۔ میں نے رو کر دعا کی یا اللہ تو تو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا ہے اس جھلساتی ہوئی صحرا میں تیرے سوا ہمارا کوئی مدد گار نہیں ہے۔

غیبی بچہ اور آسمانی دستر خوان

میری دعا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور ہاتھ ابھی چہرے پر نہیں پھیرے تھے کہ ریت کے ایک ٹیلے کے پیچھے سے ایک چار پانچ سالہ معصوم بچہ نمودار ہوا۔ وہ منظر آج بھی میری آنکھوں میں نقش ہے اس بچے کا سر تازہ منڈوایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں میں آٹے کا ایک تھیلا تھا۔ اس بنجر اور جھلساتی ہوئی صحرا میں جہاں میلوں تک انسانی آبادی کا سراغ نہ تھا اس ننھے بچے کا ظاہر ہونا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ میں نے حیرت اور امید کے ملے جلے جذبات سے اسے دیکھا۔ اس نے آٹے کا تھیلا میری طرف بڑھادیا۔ میں نے اپنی جیب سے پیسے نکالے کہ اسے دے دوں لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے جب لرزتے ہاتھوں سے تھیلے کا منہ کھولا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ تھیلے میں دس عدد پراٹھے تھے جو اتنے گرم تھے جیسے ابھی ابھی توے سے اتارے گئے ہوں۔ ان پراٹھوں کی خوشبو نے میری روح تازہ کر دی۔ اس کے ساتھ ٹھنڈے پانی کی دو بوتلیں بھی تھیں جن کے اوپر شبنم کے قطروں سے یہ گواہی مل رہی تھی کہ

یہ پانی ابھی کسی ٹھنڈے فریج سے نکالا گیا ہے۔جب میں نے حیرت سے دوبارہ بچے کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ چند سیکنڈوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ریت کے اس ہموار میدان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی وہ بچہ جیسے آیا تھا ویسے ہی غائب ہو گیا۔ میں اور علی خان ایک دوسرے کا منہ حیرت سے تکتے رہ گئے وہ کوئی عام انسان نہیں تھا وہ یقیناًاللہ کا کوئی فرشتہ یا غیبی نصرت تھی جو ہماری توبہ اور زاری کے جواب میں عرش سے بھیجی گئی تھی۔ہم نے وہ پراٹھے کھائے اور پانی پیا جس سے ہمارے مردہ وجود میں نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ وہ خوراک صرف خوراک نہیں تھی وہ اللہ کی طرف سے بھیجا گیا من وسلویٰ تھا جس نے ہمیں یہ احساس دلایا کہ جب دنیا کے تمام دروازے بند ہو جائیں تو اللہ کی نصرت وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں انسانی عقل دنگ رہ جائے۔ ہم جو دن بھر اذیتوں سے چور تھے پھیلتے ہی نیند کی وادی میں کھو گئے تھے۔تقریبا رات کا کوئی پہر تھا کہ گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے میری آنکھ کھلی ۔یہ ہمارے ایجنٹ تھے جو تھوڑے غصے اور گالیوں کے بعد مجھے او علی خان کو ساتھ لے

گئے۔رات خواب گاہ میں گزاری لیکن بغیر نیند کے کیونکہ خوابگاہ میں مسافر زیادہ تھے۔اور جگہ چھوٹی تھی لہذا بیٹھنے کی جگہ اتنے مشکل سے ملی تھی۔

ایران کا صحرا اور تشدد کا آغاز

اگلے دن انہوں نے ہمیں 18 افراد کو ایک چھوٹی ڈاٹسن گاڑی میں اس طرح ٹھونسا کہ آٹھ گھنٹوں کا وہ سفر کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ گاڑی کی لائٹیں بند تھیں اور ہم موت کے سائے میں سفر کر رہے تھے۔ میری زبان پر صرف سورہ یٰسین اور آیت الکرسی کا ورد تھا۔ایران میں داخل ہوتے ہی ہمیں ایک گھر میں قید کر دیا گیا جہاں پانی کا ایک گلاس بھی ہزار روپے میں مل رہا تھا۔ وہاں عمران نامی ایجنٹ کا قانون بہت سخت تھا اور وہ چھوٹی سی بات پر ہمیں بچوں کی طرح پیٹتا تھا۔ پھر ہمیں جھلستے ہوئے صحراؤں اور پہاڑوں میں آزاد چھوڑ دیا گیا جہاں بھوک پیاس اور گرمی کی وجہ سے ہمارے ہونٹ خشک ہو کر پھٹ گئے۔ شیراز پہنچنے پر تلاشی کے دوران ہمارے آدھے پیسے چھین لیے گئے اور زبردستی چھ

ہزار کا سم کارڈ لینے پر مجبور کیا گیا۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے ساتھ ایجنٹوں کا رویہ بہت وحشیانہ تھا۔

سفاک قاتل

اسی کٹھن سفر میں ایک ایسا دلدوز واقعہ پیش آیا جس نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔ ہمارے قافلے میں ایک شخص کو اچانک اپینڈکس کا شدید درد شروع ہوا۔ وہ تکلیف سے تڑپ رہا تھا لیکن ایجنٹ کے دل میں رحم کے بجائے یہ خوف پیدا ہوا کہ اس کی بیماری اور چیخوں کی وجہ سے ہم سب پکڑے جائیں گے۔ ایجنٹ نے بے رحمی کی انتہا کر دی اس نے بیمار آدمی کے بھتیجے کے ہاتھ میں چھرا دیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے چچا کو ختم کر دو۔ بھتیجا کیسے یہ ہمت کر سکتا تھا کہ اپنے سگے چچا پر وار کرے؟ اس نے روتے ہوئے انکار کر دیا۔ ایجنٹ نے جب دیکھا کہ لڑکا نہیں مان رہا تو اس نے خود اس سے چھرا چھینا اور اس بیمار آدمی پر بے دردی سے وار کیے اور اسے قتل کر دیا۔ ہم سب بے بسی سے یہ خونی تماشہ

دیکھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ جب اس کی سانس نکل گئی تو ہم نے وہیں پڑے پتھر جمع کیے اور اس کی لاش پر رکھ دیے تاکہ ایک عارضی قبر بن جائے اور اسے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

موت کے سائے اور ترکی بارڈر

شیراز سے آگے ہمیں تین چھوٹے گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور ایک ڈائیوو بس کے انجن کے ساتھ ایک چھوٹے آہنی باکس میں چھ افراد کو بند کر دیا گیا۔ اس حبس اور گرمی میں ہم سب موت کے قریب تھے۔ وہاں سے ہمیں ماکو کے پہاڑ پر پہنچایا گیا جو ترکی اور ایران کے درمیان سرحد ہے اور ہمیں نئے ایجنٹ سینا کے حوالے کر دیا گیا۔ وہاں دوسرے گروہ بھی پہلے سے موجود تھے۔ ایجنٹ کی طرف سے رات کی تاریکی میں ہمیں سیمنٹ کے ایک تنگ پائپ کے ذریعے جو دیوار کے نیچے سے گزر رہا تھا ترکی میں داخل کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ میرا وزن 96 کلو تھا اور مجھے دمہ کی تکلیف بھی تھی اس پائپ میں پیٹ کے بل

رینگنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ اس دوران ایجنٹ سینا نے ہمارے ساتھی بلال کو مارا جس کی وجہ سے میرا اس سے جھگڑا ہو گیا ان تمام ایجنٹوں نے مل کر مجھے بہت زیادہ مارا اور پتھروں سے لہولہان کر دیا۔

ٹنل کا خوفناک تجربہ اور گرفتاری

انتہائی زخمی حالت میں میں اس تنگ پائپ میں داخل ہوا۔ تقریباً 40 منٹ تک میں کہنیوں کے بل رینگتا رہا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری جان نکل جائے گی لیکن علی خان پیچھے سے میری ہمت بڑھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا لالہ ہمت کرو بس تھوڑا سا راستہ باقی ہے ہم پہنچ گئے ہیں۔ جب ہم دوسری طرف نکلے تو وہاں ترکی کی فوجی بکتر بند گاڑیاں اور سرچ لائٹس موجود تھیں۔ ہوائی فائرنگ ہوئی اور بھگدڑ مچ گئی۔ علی خان اور کچھ ساتھی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے لیکن میرے سمیت 61 افراد پکڑے گئے۔

ترک فوجیوں نے پہلے ہمیں مارا پھر وہی ٹنل ہم سے پتھروں سے بند کرادی اور ہمیں واپس ایران کی طرف دھکیل دیا۔ اس وقت ہم سب زخمی تھکے ہوئے بھوکے اور پیاسے تھے لیکن ایجنٹ سینا پھر نمودار ہوا اور ہم سے مزید پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا جب اسے سمجھ آگئی کہ یہاں اس کا کام نہیں بنے گا مزید پیسے نہیں مل سکتے تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

ایک نصیحت

میری تمام دوستوں سے التجا ہے کہ خدا کے لیے اس راستے پر کبھی مت جایئے گا۔ اور اگر کوئی جاتا ہے تو وہاں صرف گونگا بہرا اور اندھا بن جانا ہی انسان کی زندگی بچا سکتا ہے۔ سینا جب تقریباً دو گھنٹوں کے طویل انتظار کے بعد واپس لوٹا تو اس کے چہرے پر تھکن اور بیزاری کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کی دو چھوٹی بوتلیں اور دوسرے ہاتھ میں چند کچلے ہوئے ٹماٹر تھے۔ پانچ افراد کے لشکر کے لیے یہ خوراک سمندر میں ایک قطرے کے برابر تھی جو

ہمارے ایک دانت کو تر کرنے کے لیے بھی کافی نہ تھی لیکن اس سخت قحط زدہ حالت میں جہاں پیاس کی وجہ سے ہمارے گلے خشک ہو چکے تھے ہمیں ایسا لگا جیسے بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے من و سلویٰ اترا ہو۔ ہم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور ان ٹماٹروں کے ذروں کو بھی تبرک کی نظر سے دیکھا اور آپس میں تقسیم کر لیا۔ ابھی ہم نے اس معمولی خوراک سے زندہ رہنے کی امیدیں وابستہ کی ہی تھیں کہ سینا نے ایک ایسا اعلان کر دیا جو ہم سب پر آسمانی بجلی بن کر گرا۔ اس نے انتہائی خشک لہجے میں کہا تیار ہو جاؤ آج رات ٹھیک تین بجے ہم دوبارہ حرکت کریں گے یہ بات سنتے ہی ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نہ تو ایسے سخت سفر کے لیے تیار تھے اور نہ ہی ہمارے وجود میں کسی نئے امتحان کے لیے ذہنی سکت طاقت باقی تھی۔ بھوک پیاس اور بے شمار زخموں نے ہمیں چلتی پھرتی لاشوں جیسا بنا دیا تھا۔ ہمارے جسموں سے خون رس رہا تھا اور ظلم یہ تھا کہ ہم ننگے پاؤں تھے۔ ترک فوج نے انسانی حقوق کی تمام حدیں توڑ دی تھیں انہوں نے ہمارے کپڑے اور جوتے جلا دیے تھے اور ہمیں

صرف انڈر رویئر میں انتہائی ذلت کے ساتھ واپس دھکیل دیا تھا۔ سینا کا یہ اعلان ملک الموت کے سائے جیسا تھا لیکن ہم میں انکار کی جرات نہ تھی ہم بغاوت کا تلخ ذائقہ پہلے چکھ چکے تھے۔

بارش کا قہر اور گدلے پانی کی نعمت

رات کے تین بجے تھے کہ آسمان نے بھی ہماری بے بسی پر رونا شروع کر دیا۔ تیز اور چبھتی ہوئی بارش برس رہی تھی اور ہم سب ننگے بدن سردی سے اس طرح کانپ رہے تھے جیسے ملاکنڈ کا کوئی سیلاب زدہ بے گھری کی حالت میں لرزتا ہے۔ لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں یہی بارش ہمارے لیے پینے کا پانی ذخیرہ کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ راستے کے گڑھے میں گدلا اور مٹی ملا پانی جمع ہو رہا تھا جسے عام حالات میں شاید ہم ہاتھ لگانا بھی پسند نہ کرتے لیکن اس وقت وہ ہمارے لیے کسی بھی قیمتی منرل واٹر اور آبِ حیات سے کم نہ تھا۔ ہم نے اپنی خالی بوتلیں اس مٹیالے اور ناپاک پانی سے بھر لیں اور اسے اپنی زندگی کا کل

اثاثہ سمجھ کر سینے سے لگالیا۔ رات کے سواچار بجے سینادوبارہ نمودار ہوااس نے غافل سوئے ہوئے لوگوں کو ٹھوکریں مار کر جگایااور ہمیں دوسرے گروہوں کے ساتھ ملا کرایک بار پھر نامعلوم مسافت کی طرف دھکیل دیا۔

فوجی تشدد

تقریباً چالیس منٹ کی مسافت کے بعد خاردار تاروں کاایک موڑ سامنے آیاجس کی دوسری طرف ایک گہرانالہ تھا۔ سینانے اشارہ کیاکہ ہمیں یہاں ایک تنگ پائپ کے ذریعے دوسری طرف پار ہونا ہے۔ میرا پوراوجود زخموں سے چور تھا ہاتھوں اور پاؤں سے خون بہہ رہا تھااور اس سیمنٹ سے بنے تنگ پائپ میں داخل ہونا مجھے تقریباً ناممکن لگ رہا تھا لیکن جب موت سامنے آئے توانسان بے بس ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمت جمع کی اور جیسے تیسے دوسری طرف نکل گیا۔ ابھی ہم نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ صبح کی روشنی پھیلتے ہی ایک فوجی بکتر بند گاڑی گردوغبار کے بیچ نمودار ہوئی۔

فوجی تیزی سے گاڑی سے اترے اور خوف پھیلانے کے لیے اندھادھند فائرنگ شروع کردی۔ انہوں نے سینا کو پکڑ لیا اور چمڑے کے بیلٹ سے اس کی کمر نیلی کردی۔ سینا کو جب موقع ملا تو وہ واپس پائپ میں گھس گیا لیکن فوجیوں کا تمام غصہ ہم بے گناہ لوگوں پر نکلا۔ انہوں نے ہمیں ان نوکیلے پتھروں کرش پر جو زمین پر پڑے تھے گھسیٹا اور ننگے پاؤں ان پر ہم سے دوڑیں لگوائیں۔ اس وحشیانہ تشدد کے بعد انہوں نے ہمیں ایک ایک کر کے اسی پائپ کے ذریعے واپس ایران کی طرف دھکیل دیا۔

پشتون خون کی بغاوت

جب ہم واپس ایران کی حدود میں پہنچے تو سینا ایک پتھر کے پیچھے سے اس حال میں نکلا کہ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی لیکن ہم خاموش تھے۔ قریب ہی ایک غار تھا جو اندر سے معجزاتی طور پر ایئر کنڈیشنر کی طرح ٹھنڈا تھا۔ وہاں دو کتے سو رہے تھے جب انہوں نے

ہمیں دیکھا تو ایک کتا باہر چلا گیا اور دوسرے نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا اور واپس سو گیا۔ جب ہم وہاں دس منٹ بیٹھے تو اس غیر معمولی ٹھنڈک نے ہمارے زخموں میں درد پیدا کر دیا اس لیے ہم واپس باہر جھلساتی ہوئی دھوپ میں آ گئے۔

یہیں میرے رگوں میں پشتون خون نے جوش مارا جس کی فطرت میں ہمیشہ سے بغاوت شامل ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے کان میں فرار کا مشورہ دیا یہاں مرنے سے یہ بہتر ہے کہ بھاگ نکلیں یا تو ہم ایرانی فوج کے حوالے کر دیے جائیں گے یا پھر پیدل تہران پہنچ جائیں گے۔ شہزاد گجر ثقلین اور چیمہ کے پاس پہلے سے ایران کے ویزے تھے اس لیے ہمیں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ہم نے راستے میں پڑے ہوئے پرانے کپڑے اور بوتلیں اٹھالیں وہاں آپ کو ہر طرف پرانے کپڑے اور ڈھیروں پلاسٹک کی بوتلیں نظر آئیں گی جو ہم سے پہلے جانے والے لوگوں نے حالات اور بوجھ کی وجہ سے وہاں پھینکی ہوتی ہیں۔ جب

اندھیرا ہوا تو ہم نے فرار ہونے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ہماری سب سے بڑی غلطی تھی وہ پورا علاقہ ایجنٹوں اوران کے زیرِاثر پولیس کا تھا۔

بلیڈ کی تیز دھار

ہم نے ابھی صرف دو تین گھنٹے کی مسافت ہی طے کی تھی کہ پیچھے سے سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ہم خوش ہوئے کہ شاید ایرانی فوج آگئی اور ہمیں گرفتار کر کے واپس پاکستان بھیج دے گی لیکن وہ سیناااور اس کے خونخوار ساتھی تھے۔ انہوں نے پہنچتے ہی ہم پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ سینا نے میری ناک پر اتنی زوردار ٹکر ماری کہ ناک سے خون کا ایک نہ رکنے والا فوارہ جاری ہو گیا۔ انہوں نے ہماری کمروں پر پانچ پانچ کلو وزنی پتھر مارے جس کی وجہ سے ہمارا حال بالکل خراب ہو گیا۔ سینا نے غصے میں ہمارے ایک ساتھی گجر کے بیگ سے استرا پا کھی نکالا اور اس کی گردن پر پھیر دیا۔ میں نے جب اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بالوں سے پکڑ ازمین پر پٹخ دیااور استرا میری

گردن پر پھیرا جس سے خون کی ایک باریک لکیر نمودار ہوئی۔ گجر کے بدن پر زنجیر زنی ماتم کے نشانات دیکھ کر وہ مزید غصے میں آ گیا میرے خیال میں گجر شیعہ تھا لیکن جب میں نے گجر کا خون روکنے کے لیے اس کے زخم پر ہاتھ رکھا تو سینا نے میرے ہاتھ پر بھی وار کیا اور میرے ہاتھ سے بھی خون جاری ہو گیا۔ پھر پتہ نہیں کیوں اس کا دل نرم ہوا اور اس نے ہمیں چھوڑ دیا اور صفت نامی ایجنٹ کو فون کیا کہ کل مجھ سے ملنا۔ میں نے راستے سے اٹھائی ہوئی ایک سفید بنیان پھاڑی اور گجر کے زخم پر پٹی باندھی تاکہ اس کا خون رک جائے۔

افشین فرشتہ بہن

اس خوفناک رات کے بعد صبح صفت نامی ایک شخص ہم تین افراد شہزاد چیمہ اور مجھے ایک گاؤں لے گیا جہاں ہماری ملاقات ایک خاتون افشین سے ہوئی۔ افشین صفت کی بیوی تھی ایک پتلون اور قمیص پینٹ شرٹ میں ملبوس خود اعتماد اور خوبصورت خاتون۔ اس نے جب ہماری حالت دیکھی تو بہت دکھی ہوئی اور

ہمارے لیے چکن اسپگیٹی پکائی جو ہماری زندگی کی سب سے لذیذ خوراک ثابت ہوئی۔اس نے ہمارے ناپ کے جوتے اور کپڑے منگوائے اور ہمارے زخموں پر مرہم بھی رکھا۔ وہاں تین چار دن گزارنے کے بعد جب ہماری حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیں ہر صورت ترکی کا بارڈر پار کرائے گی۔

کامیابی اور ماضی کی یادیں

اس بار ہم افشین بہن کے بتائے ہوئے مختصر راستے اور چیمہ کی ہمت کی برکت سے خاردار تاروں کو پار کرنے اور ترکی کی سرزمین پر قدم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ چیمہ نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر خاردار تاروں میں پھنسے ہوئے میرے پاؤں چھڑائے اس کا یہ احسان میں تمام عمر نہیں بھولوں گا۔اب ہم ترکی کے شہر وان کی طرف رواں دواں تھے۔

وان شہر کی تاریخ

شہرِ وان ترکی کے مشرق میں واقع ایک قدیم اور قدرتی خوبصورتی سے مالامال شہر ہے۔ یہ شہر وان جھیل کے کنارے واقع ہے اور ایران کے بارڈر کے قریب ہے۔ وان ان شہروں میں سے ایک ہے جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ تقریباً 3000 سال پہلے وان اورارتو سلطنت کا حصہ تھا اس وقت اس شہر کو توشپا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ شہر کے مرکز میں ایک بہت بڑا اور تاریخی قلعہ موجود ہے جو اورارتو دور کی نشانی ہے۔ وان جھیل ترکی کی سب سے بڑی جھیل ہے اور اس شہر کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھی جاتی ہے۔ اس جھیل کا پانی نمکین ہے جو جلد کی بعض بیماریوں کے لیے مفید مانا جاتا ہے۔ اس جھیل میں چند جزیرے بھی ہیں جن میں سب سے مشہور اکدامار جزیرہ ہے جہاں ایک بہت پرانا آرمینیائی کلیسا بھی موجود ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔ وان ترکی میں چند چیزوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ وان کی بلیاں یہ بلیاں پوری دنیا میں مشہور

ہیں کیونکہ ان کی ایک آنکھ کا رنگ سبز اور دوسری کا زرد یا نیلا ہوتا ہے۔ان کی ایک اور عجیب صفت یہ ہے کہ یہ پانی سے نہیں ڈرتیں اور تیراکی کر سکتی ہیں۔وان کا ناشتہ ترکی میں وان کا ناشتہ چائے بہت مشہور ہے جس میں علاقے کا خالص شہد پنیر اور دیگر قدرتی اشیاء شامل ہوتی ہیں۔ ایران کے بارڈر سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ شہر ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ بہت سے ایرانی خریداری کے لیے وان آتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی آمدنی کا بڑاذریعہ گلہ بانی اور زراعت ہے۔ وان ایک بلند اور پہاڑی علاقے میں واقع ہے یہاں سردیوں میں بہت سردی اور برف باری ہوتی ہے جبکہ گرمیاں معتدل اور خوشگوار ہوتی ہیں جو سیاحوں کے لیے بہترین وقت ہے۔

وان پہنچ کر میں وہاں ایک پتھر پر بیٹھا تھا کہ بلوچستان کا وہ دن میری آنکھوں کے سامنے آگیا جب ہم پیاس سے پاگل ہو رہے تھے اور گدلے پانی کے ایک گڑھے پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ مجھے علی خان یاد آیا جس نے مجھے اس وقت ڈھونڈ نکالا جب گدھ میرے گرد منڈلا رہے تھے اور میری جان نکلنے

والی تھی۔ اور ان سب سے بڑھ کر مجھے وہ پانچ سالہ معصوم بچہ یاد آیا جو اس جھلساتی ہوئی صحرا میں پراٹھوں کے تھیلے اور ٹھنڈے پانی کے ساتھ نمودار ہوا ہمیں زندگی کا تحفہ دیا اور پلک جھپکتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ یقیناً کوئی فرشتہ تھا جسے اللہ نے ہماری فریاد سننے کے لیے بھیجا تھا۔

وان کا سفر اور ایجنٹوں کی بے رحمی

ہمارا سفر وان کی طرف جاری تھا لیکن یہ سفر کسی خوشگوار منزل کی تلاش کے بجائے خوف ڈر اور بے بسی کا مجموعہ تھا۔ راستے میں قدم قدم پر انسانی اسمگلنگ کے ایجنٹ شکاریوں کی طرح چھپے بیٹھے تھے اور ہم سے مختلف طریقوں سے پیسے بٹور رہے تھے۔ کبھی وہ ہمیں کھانے کی امید دلاتے کبھی پانی کی کمی کا ڈر دکھاتے اور کبھی چوروں کے فرضی خوف کے بہانے ہماری جیبیں خالی کرتے۔ حد تو یہ تھی کہ جب ان کا بس نہ چلتا تو وہ جبر اور زبردستی سے بھی کام لیتے تھے۔ میرے پاس میری پوری زندگی کی جمع پونجی تقریباً 35 ہزار روپے تھے

جو میں نے بڑی احتیاط سے اپنے بیگ میں چھپا رکھے تھے تاکہ برے وقت میں کام آئیں۔ لیکن بدقسمتی سے راستے میں ایجنٹوں نے ایک چال چلی اور ہمیں پولیس کا ڈر دکھا کر ہمارے بیگ ہم سے لے لیے۔ انہوں نے کہا کہ پولیس تلاشی لے رہی ہے اس لیے اپنا سامان ہمارے حوالے کر دو۔ اس بیگ میں نہ صرف میری نقد رقم تھی بلکہ میری ادویات اور ضروری کپڑے بھی تھے جو چند لمحوں میں مجھ سے چھین لیے گئے اغوا کر لیے گئے۔

وان کی خواب گاہ اور قید کے تلخ دن

وان پہنچنے کے بعد ہمیں ایک ایسی جگہ لے جایا گیا جسے ایجنٹ اپنی اصطلاح میں خواب گاہ سونے کی جگہ کہتے ہیں۔ یہ خواب گاہ دراصل ایک تاریک جیل تھی جہاں غیر قانونی تارکینِ وطن کو جانوروں کی طرح ٹھونسا جاتا تھا تاکہ وہاں سے انہیں دوسرے مختلف شہروں میں اسمگل کیا جا سکے۔ ہم وہاں سات دن قید رہے وہاں زندگی اور موت کے درمیان بہت باریک لکیر باقی رہ گئی تھی۔ ہر

روز صبح 11 بجے اور پھر رات 11 بجے ہمیں خشک روٹی کا ایک ٹکڑا دیا جاتا جو اتنا سخت اور بے ذائقہ ہوتا کہ حلق سے اتارنا بھی ایک معرکہ تھا۔

ایجنٹ کی بے رحمی اور بے حسی کا یہ حال تھا کہ اس نے ہر مسافر سے ایک لاکھ بیس ہزار کلدارے روپے لیے تھے اور بدلے میں انہیں ایک جعلی کارڈ دیا تھا جسے وہ برگہ کہتے تھے۔ یہ کارڈ دراصل ترکی کی شہریت کا ایک بوگھس اور جعلی کاغذ تھا۔ اس کے بعد ہمیں ایک ایسی گاڑی میں ٹھونسا گیا جس میں بمشکل چند افراد کی جگہ تھی لیکن وہاں 60 افراد بیٹھے تھے۔ گاڑی بسوں کے اڈے اوتوگار ترکی زبان میں اوتوگار بس ٹرمینل یا اڈے کو کہتے ہیں کی طرف روانہ ہوئی راستے میں ایجنٹ مسلسل پولیس کے ساتھ رابطے میں تھے یہاں تک کہ انہوں نے خود ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا۔

حکومتی کیمپ کی زندگی اور ڈی پورٹ ہونے کا خوف

پولیس نے ہمیں مختلف مراحل سے گزارا اور آخر میں ترکی کے ایک بہت بڑے غیر ملکی مہاجر کیمپ کے حوالے کر دیا یہ کیمپ ازمیر میں واقع تھا۔ ازمیر Izmir شہر جو قدیم زمانے میں سمیرنا Smyrna کے نام سے جانا جاتا تھا ترکی کا تیسرا بڑا شہر اور بحیرہ ایجیئن Aegean Sea کے کنارے واقع قدیم ترین اور تاریخی علاقوں میں سے ایک ہے۔

یہاں ازمیر کی ہزاروں سالہ تاریخ کی تفصیل درج ہے

- ازمیر کی تاریخ تقریباً 8500 سال پرانی ہے۔ نو سنگی دور Neolithic کے آثار بتاتے ہیں کہ یہ اناطولیہ کی قدیم ترین بستیوں میں سے ایک تھی۔
- یہ شہر پہلے یونانیوں نے آباد کیا اور مشہور شاعر ہومر Homer کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اسی شہر میں رہتا تھا۔

- سکندرِ اعظم نے اس شہر کی نئی بنیاد پاگوس کی پہاڑی پر رکھی۔ رومی دور میں ازمیر نے اپنا سنہری دور گزارا اور یہ ایشیا کا اہم تجارتی و مذہبی مرکز رہا۔
- 1424 میں سلطان مراد ثانی نے اسے مکمل طور پر خلافتِ عثمانیہ کا حصہ بنایا۔ عثمانی دور میں یہاں یہودی عیسائی اور مسلمان مل کر رہتے تھے اسی لیے اسے گیاور ازمیر تنوع والا شہر کہا جاتا تھا۔
- 9 ستمبر 1922 ازمیر کی تاریخ کی اہم ترین تاریخ ہے جب مصطفیٰ کمال اتاترک کی فوج نے اسے یونانیوں سے آزاد کرایا۔ آج ازمیر ترکی کا ایک جدید سیکولر اور ترقی یافتہ شہر ہے جسے ایجیئن کا موتی کہا جاتا ہے۔

وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے ہماری تذلیل کی گئی ہمارے جوتے کپڑے تسمے بیلٹ اور ہر چیز ہم سے لے لی گئی اور جیل کے مخصوص کپڑے پہنا دیے گئے۔ ہماری شناخت ایک قیدی کے طور پر ہوئی تصاویر لی گئیں اور ایک فارم پر ہماری

دسوں انگلیوں کے نشانات فنگر پرنٹس لیے گئے۔ ہمیں پلاسٹک کا ایک عارضی کارڈ دیا گیا جو ہماری نئی پہچان تھی۔ جب میں نے ایک پولیس والے سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا ہو سکتا ہے تم یہاں چھ ماہ سے ایک سال تک رہو اور اس کے بعد تمہیں تمہارے وطن ڈی پورٹ واپس کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں آیا تھا۔

کیمپ کی سلیمانی چائے کا ذائقہ

اگرچہ کیمپ کی زندگی جیل جیسی تھی اور نظم وضبط کی سخت پابندیاں تھیں لیکن انسانی ہمدردی کی بنیاد پر سہولیات بھی موجود تھیں۔ ہمیں نہانے کے لیے گرم پانی شیمپو صابن تولیہ اور روزمرہ ضرورت کی ہر چیز دی جاتی تھی۔ دن میں تین وقت کھانا ملتا۔ صبح کا آغاز سلیمانی چائے کالی پتی کا قہوہ سے ہوتا جس میں دودھ نہیں ہوتا تھا ساتھ میں ٹماٹر کھیرا ابلا ہوا انڈا یا کوئی پھل ملتا۔ دوپہر میں ابلے

چاول پاستا یا گندم کا دلیہ ہوتا جبکہ رات کو دہی اور کبھی گوشت کا سالن شوربہ دیا جاتا۔ سگریٹ پینے والوں کو سگریٹ دیے جاتے اور جو نہیں پیتے تھے انہیں 10 منٹ کے لیے پارک میں تازہ ہوا لینے کی اجازت ملتی۔ یہ 10 منٹ ہماری پورے دن کی قید میں سکون کے چند لمحات ہوتے تھے۔

سامسون کا سفر اور ایجنٹ کی غداری

کیمپ میں تقریباً 15 دن گزارنے کے بعد ہمیں نئے برگے کارڈ دیے گئے اور ترکی کے شہر سامسون بھیج دیا گیا۔ روانگی سے قبل ہمارا مکمل طبّی معائنہ ہوا تاکہ تصدیق ہو سکے کہ کوئی بیمار تو نہیں۔ 12 گھنٹے کی مسافت کے بعد جب ہم سامسون پہنچے تو وہاں کے سمندر کے کنارے اور ترقی نے ایک لمحے کے لیے ہمیں حیران کر دیا۔ سامسون ترکی کے شمال میں بحیرہ اسود Black Sea کے کنارے واقع ایک تاریخی اور ترقی یافتہ شہر ہے جسے بحیرہ اسود کا دارالحکومت بھی کہا جاتا ہے۔

ترکی کی جدید تاریخ میں سامسون کا مقام بہت خاص ہے کیونکہ مصطفیٰ کمال اتاترک نے 19 مئی 1919 کو اسی شہر سے ترکی کی آزادی کی جنگ کا آغاز کیا تھا۔ یہاں کی آب وہوا معتدل ہے اور بارشوں کی وجہ سے یہ علاقہ بہت سرسبز ہے۔ یہاں ترکی کی ایک بڑی یونیورسٹی اوندو کوزمائیس بھی واقع ہے۔

لیکن ہماری حقیقت یہ تھی کہ ہم صرف پناہ گزین تھے۔ وہاں پولیس نے ہمیں روکا لیکن کارڈ دیکھ کر چھوڑ دیا اور ہدایت کی کہ کل صبح کمشنر کے دفتر میں حاضر ہوں۔ ہمارے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی لہٰذا وہ سرد رات ہم نے بسوں کے اڈے پر بنچوں پر گزاری۔ اگلے دن ہم کمشنر آفس گئے تو ہمیں 15 دن کی رہائش کی اجازت نامہ مل گیا لیکن یہ صرف سامسون شہر تک محدود تھا۔ جب ہم نے ایجنٹ کو فون کیا کہ ہمیں استنبول پہنچائے تو اس نے بڑی بے شرمی سے جھوٹ بولا کہ ٹکٹ مل جائے گا لیکن جلد ہی اپنا موبائل بند کر دیا اور جاتے جاتے پیغام دیا مجھے میرے پیسے مل چکے ہیں اب تم زندہ رہو یا مرو میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں۔

مصلحتی جھوٹ اور استنبول کی منزل

ہم سامسون میں پھنس گئے تھے کیونکہ بس اڈوں کو حکم تھا کہ ہمیں شہر سے باہر نہ جانے دیں۔ میرے پیسے ختم ہو چکے تھے اور زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے میں سخت فکر مند تھا۔اس مشکل وقت میں میں نے اپنے صوابی کے ساتھی سجاد کے ساتھ مل کر استنبول میں اپنے دوسرے دوست عزیز سے رابطہ کیا۔جب قانونی طریقے سے ٹکٹ نہ ملا تو ہم نے ایک مصلحتی جھوٹ کا سہارا لیا ہم نے کہا کہ حالیہ سمندری حادثے میں میرا بھائی ڈوب گیا ہے اور میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے واضح رہے کہ ہمارے آنے سے پہلے ایک حادثہ ہوا تھا جس میں یونان جانے والی کشتی ڈوب گئی تھی۔

اس انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہمیں ٹکٹ دے دیا گیا۔عزیز نے اپنے پاس سے آن لائن پیسے دیے اور اس طرح ہم 38 گھنٹے کے سخت سفر کے بعد استنبول پہنچ گئے۔ واستنبول کی تاریخ تہذیب و تمدن کی ایک ایسی داستان ہے جس کا آغاز

ہزاروں سال پہلے یونانی مہاجرین کے ہاتھوں بازنطیم کے نام سے ہوا لیکن اسے اصل شہرت تب ملی جب 330 عیسوی میں شہنشاہ قسطنطین نے اسے سلطنتِ روم کا نیا دارالحکومت قرار دے کر اس کا نام قسطنطنیہ رکھا۔ یہ شہر صدیوں تک عیسائیت فن اور تجارت کا عالمی مرکز رہا اور اپنی مضبوط فصیلوں کی بدولت ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ بنا رہا یہاں تک کہ 1453 میں خلافتِ عثمانیہ کے جوان سلطان محمد فاتح نے اسے فتح کر لیا۔ بازنطینی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی انہوں نے یہاں عثمانی دبدبے کی بنیاد رکھی اور اس شہر کو خوبصورت مساجد محلوں اور مدرسوں سے سجا کر دنیا کی طاقتور ترین اسلامی خلافت کا مرکز بنا دیا۔ 1923 میں جمہوریہ ترکی کے قیام کے بعد اگرچہ دارالحکومت انقرہ منتقل کر دیا گیا اور اس شہر کا نام باقاعدہ طور پر استنبول پڑ گیا لیکن یہ آج بھی اپنے جغرافیائی محلِ وقوع ایشیا اور یورپ کے درمیان پل اور عظیم الشان تاریخی ورثے کی وجہ سے دنیا کے اہم ترین اور خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے جو بازنطینی عیسائیت اور عثمانی اسلامیت کی ثقافتوں کا ایک حسین سنگم پیش کرتا ہے۔

ہاں پہنچ کر جب عزیز سے ملے تو وہ ہمارے لیے بر گر اور پیپسی لایا وہ صرف کھانا نہیں تھا بلکہ ایک نئی زندگی کا احساس تھا۔ عزیز کے گھر میں ہم 16 افراد تھے جو پاکستان اور افغانستان سے آئے تھے لیکن ہم سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک اور بھائی بن چکے تھے۔

استنبول میں روزگار کی کوششیں اور ترکی معاشرہ

استنبول میں زندگی آسان نہ تھی۔ میری زندگی کے وہ دن بہت کٹھن تھے کئی روز گھر پر بے کاری میں گزرے اور جیب بالکل خالی تھی۔ جب میرے کمرے کے ساتھی کھانا تیار کرتے تو میں کسی نہ کسی بہانے باہر نکل جاتا تاکہ انہیں لگے کہ میں کھانا کھا چکا ہوں۔ وہاں انڈی والی اشتراکی سسٹم تھا جس میں سب دوست مل کر ہفتہ وار رقم جمع کرتے تھے تاکہ گھر کا راشن بجلی گیس اور پانی کے بل ادا کیے جا سکیں۔ میرے دوستوں نے بہت اصرار کیا کہ جب تک تم کام سے نہیں لگ جاتے تم ہمارے مہمان ہو لیکن میری غیرت اور خودداری کو یہ

گوارا نہ تھا کہ میں کسی پر بوجھ بنوں یا ادھار لوں۔ ترکی میں روٹی کو ایکمک Ekmek کہتے ہیں۔ جب سب دوست کام پر چلے جاتے تو میں پچھلے دنوں کی بچی ہوئی وہ روٹیاں اٹھاتا جن پر فنگس الّی لگنے کی وجہ سے نیلاہٹ آچکی ہوتی تھی۔ میں انہیں دھوتا اور گرم پانی میں نرم کر کے کھالیتا حالانکہ اکثر طبیعت اس قدر بگڑ جاتی کہ الٹی ہو جاتی۔ ایک دن میرے دوست عزیز نے بھانپ لیا اور ہنستے ہوئے کہا اے خدا کے ظالم یہ بھائی کس دن کام آئیں گے؟ چلو تیار ہو جاؤ آج باہر گھومنے چلتے ہیں۔ ہم استنبول کے علاقے داؤد پاشا سے نکلے۔ یہ علاقہ عثمانی دور کے مشہور سپہ سالار کوکا داؤد پاشا کے نام سے منسوب ہے جنہوں نے سلطان بایزید ثانی کے دور میں عظیم خدمات انجام دیں۔ ہم میٹرو کے ذریعے آق سرائے Aksaray پہنچے۔ یہ فاتح کے علاقے کا وہ مصروف ترین مرکز ہے جو اپنے الیکٹرونکس موبائل مارکیٹس اور کپڑوں کے بڑے بازاروں کی وجہ سے پوری دنیا بالخصوص پاکستان اور افغانستان کے تاجروں کی پہلی پسند ہے۔ وہاں ہم نے سب سے پہلے Samsung J7 Prime خریدا — وہ

موبائل جو اپنی مضبوط دھاتی باڈی اور پائیداری کی وجہ سے آج بھی ایک بہترین انتخاب مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد عزیز نے میرے لیے کپڑے اور جوتے خریدے ہم نے ہوٹل میں پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور آخر میں اس نے مجھے 500 لیرا ترک کرنسی بھی دیے اور کہا کہ جب کام لگ جائے تو لوٹا دینا۔ شاپنگ کے تمام اخراجات بھی اسی نے اٹھائے۔ سچ تو یہ ہے کہ پردیس میں عزیز جیسے دوست ہی انسان کا حوصلہ ہوتے ہیں۔

میں نے کئی دن کارخانوں کے چکر لگائے اور ہر دروازے پر پوچھتا ایلمان لازم وار؟ کیا کاریگر کی ضرورت ہے؟۔ شروع میں ہر جگہ سے نانہیں کا جواب ملا پھر ایک جگہ اوتوچی کپڑے استری کرنے کا کام ملا جو کچھ عرصہ بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے ایک اور کارخانے میں 1200 لیرے پر کام شروع کیا جہاں فینسی قمیصیں بنتی تھیں۔ میری کوششیں جاری تھیں یہاں تک کہ ایک کلینک میں مترجم Translator کے طور پر کام کا موقع ملا لیکن غیر قانونی ہونے کی وجہ سے وہ کام ہاتھ سے نکل گیا۔ آخر کار عزیز کی مدد سے ایک ایسے کارخانے

میں کام ملا جہاں دروازوں کے ہینڈل بنتے تھے وہاں تنخواہ 1800 لیرے تھی جو میرے لیے بڑا سہارا بنی۔

ترکی میں ایک سال گزارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ترک قوم اپنے وطن اور کام سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ وہاں سیٹھ ہو یا مزدور سب مل کر کام کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ ترک لوگ اتنے اصولی ہیں کہ میں تین دن کام پر جلدی گیا تو جب جمعرات کو میری تنخواہ آئی تو اس کے اوپر کچھ ریزگاری جسے وہاں قروش کہتے ہیں زائد تھی میں حیران ہوا تو انہوں نے بتایا کہ تم تین دن وقت سے پہلے آئے تھے اس کا معاوضہ ہے۔ ایک اور واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا جب میں نے 25 کلو وزن اکیلے اٹھایا تو ادارے نے مجھ پر جرمانہ کر دیا کہ میں نے اپنی صحت کی پرواہ کیوں نہیں کی۔ جو قوم ایک انسان کی صحت اور حقوق کا اتنا خیال رکھتی ہے ان کی ترقی میں پھر کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ ہماری جمعہ اور ہفتہ کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔ ہم تین چار دوست سیاحت Tourism کے بہت شوقین تھے۔ ہم ہر جمعہ اور ہفتہ ترکی کے تاریخی مقامات کی سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ جمعہ کا دن تھا دوستوں نے آپس میں ارادہ کیا کہ عظیم صحابیِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزارِ اقدس کی زیارت کے لیے چلتے ہیں۔ یہاں پہلے میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ان کے بلند مقام کا ذکر کروں گا اس کے بعد دوبارہ اپنی سفر نامے کو طوالت دوں گا

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا تعارف اور مقام

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ جن کا اصل نام خالد بن زید تھا مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج کے بڑے اور مانے ہوئے جلیل القدر صحابہ میں سے تھے۔ انہیں اسلامی تاریخ میں میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان کا

بہت اونچا مقام اس لیے حاصل ہوا کیونکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو آپؐ سات ماہ تک ان کے گھر میں مہمان رہے۔

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے تمام اہم جنگوں مثلاً بدر احد اور خندق میں بڑی بہادری اور جوانمردی کے ساتھ حصہ لیا تھا اور زندگی کے آخری لمحے تک علم اور جہاد کی راہ میں دین کی خدمت کی۔ آپ ایک نہایت پرہیزگار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے محبت کرنے والے انسان تھے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ احادیث بھی روایت کی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ کے ہر ایک گھر میں خوشی کی وجہ سے ایک عجیب قسم کا شور و غل جوش و خروش برپا تھا۔ انصار کے ہر قبیلے اور ہر ایک خوش نصیب کی یہ دلی تمنا تھی کہ کاش مہمانی کا یہ شرف مجھے مل جائے۔ جب کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی قصواء کسی کے گھر کے سامنے سے گزرتی تو وہ لوگ دوڑ کر اونٹنی کی مہار پکڑ

لیتے اور بڑی محبت سے عرض کرتے کہ اے اللہ کے رسول ہمارے ہاں تشریف لائیے یہاں آپ کا بہت خیال رکھا جائے گا حفاظت کا مکمل انتظام ہے اور خدمت کا ہر قسم کا سامان تیار ہے۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بہت زیادہ نرمی کے ساتھ فرماتے تھے کہ اس اونٹنی کی مہار چھوڑ دو اسے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ یہ کہاں ٹھہرے گی۔ تمام لوگ انتظار میں کھڑے تھے کہ دیکھیں یہ بخت آور خوش نصیب اونٹنی کس کی دہلیز در شل پر بیٹھے گی۔اونٹنی اسی طرح رواں دواں تھی یہاں تک کہ جب بنی نجار کی گلی میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے پہنچی تو وہاں پہلے ایک مرتبہ بیٹھی پھر دوبارہ کھڑی ہو گئی تھوڑا سا آگے بڑھی اور پھر واپس مڑ آئی اور اسی پہلے والی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے یہ کلمات نکلے کہ ان شاءاللہ یہی منزل ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جب یہ

حال دیکھا تو وہ خوشی کے مارے اپنے کپڑوں جامے میں نہیں سما رہے تھے انہوں نے فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سامان اور کجاوہ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اپنے گھر لے گئے۔ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے یہ بہت بڑی عزت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصے برخ٥میں ڈال دی اور وہ تاریخ کے سب سے زیادہ خوش نصیب میزبان بن گئے۔

استنبول میں مزار کا مقام اور تفصیل

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار استنبول میں ایوب سلطان کے نام سے تمام مسلمانوں کے لیے عقیدت کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔ سن 52 ہجری میں جب مسلمانوں کا لشکر قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کے باوجود کہ وہ بوڑھے تھے اس سفر میں شرکت کی۔ محاصرے کی حالت میں ان کی وفات ہوئی اور اپنی وصیت کے مطابق قسطنطنیہ کی دیواروں کے پاس ایسی جگہ پر خاک

کے سپرد کیے گئے جو دشمن کی زمین کے قریب تھی۔ جب 1453 میں سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر دریافت کی اور وہاں ایک اعلیٰ جامع مسجد اور مقبرہ تعمیر کروایا۔ آج کل یہ جگہ استنبول کا سب سے پاک اور مقدس مقام مانی جاتی ہے اور ہر سال لاکھوں لوگ ان کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

داود پاشا میں ہمارے گھر سے ایوب سلطان تک تقریباً ایک گھنٹہ اور 10 منٹ لگتے تھے۔ پہلے داود پاشا اسٹیشن سے میٹرو M1A لائن لیں جو ینی کاپی کی طرف جاتی ہے۔ سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ مالٹیپے اسٹیشن پر اتر جائیں۔ اسٹیشن سے باہر نکلیں اور وہاں سے ایوب سلطان کی طرف جانے والی بس جیسے 39 یا 39Y لیں۔ اگر آپ تھوڑا گھومنا چاہیں تو مالٹیپے سے ٹیکسی میں بھی 5-10 منٹ میں مزار تک پہنچ سکتے ہیں۔ جب آپ ایوب سلطان اسٹاپ پر اتریں گے تو مسجد اور مزار بالکل آپ کے قریب ہیں۔

ہم داود پاشا سے قریب ہی واقع اوتوگار بس اسٹیشن آ گئے وہاں سے ہم تین دوست میٹرو میں سوار ہوئے اور مالٹیپے اسٹاپ پر اتر گئے۔ پھر ایکس مال Axis Mall کے راستے سے سلطان ایوب روڈ پر جو سمندر کے کنارے واقع ہے روانہ ہوئے۔اور تقریباً 40 منٹ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار تک پہنچ گئے۔ میرے ساتھ دوسرے دوست عزیز اور عمر تھے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کی زیارت

مزار کے دروازے پر ہماری تلاشی لی گئی۔ مزار میں داخل ہونے کا کسی قسم کا کوئی ٹکٹ نہ تھا۔ مزار سے متصل ایک بڑی مسجد بھی ہے۔ جب ہم مزار میں داخل ہوئے تو پہلے ہم نے زیارت کی۔ نفل اور دعا کے بعد ہم نے مزار کے مقدس اور تاریخی منظر پر روشنی ڈالنا شروع کی۔ پہلی چیز جو دلکش تھی وہ مزار کے نقش و نگار تھے جن پر فن کے ماہرین نے اپنی مہارت استادی اور تجربے کی

حد تمام کر دی تھی۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار عثمانی خلفاء کے ہنر اور محبت کی ایک ایسی نشانی ہے کہ جس سے انسان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ مزار کی دیواروں پر ازنک Iznik کی مشہور آسمانی اور سبز رنگ کی نقش و نگاری کی گئی ہے جسے دیکھنے سے انسان کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ اس نقش و نگار میں پھولوں پتیوں اور عجیب قسم کے غنچوں کے ایسے بے نظیر ڈیزائن بنائے گئے ہیں جو عثمانی دور کے فنکاروں کا کمال پیش کرتے ہیں۔

مزار کے اندر اور باہر جب انسان دیکھتا ہے تو قرآن شریف کی آیات اتنے خوبصورت خط میں لکھی گئی ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ خاص طور پر وہ سونے سے لکھی ہوئی خطاطی نے تو مزار کا دبدبہ مزید بڑھا دیا ہے۔ مزار کے اوپر گنبد اور چھتیں رنگین نقش و نگار سے بھری ہوئی ہیں اور بعض جگہوں پر عقیدت کی نشانی کے طور پر چاندی بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ سب کچھ صرف سجاوٹ کے لیے نہیں ہے بلکہ جب کوئی شخص وہاں کھڑا ہوتا ہے تو یہ نقش و نگار اسے اسلام

کی پرانی عظمت اور صحابہ کرام کے ساتھ مسلمانوں کی پاک اور خالص محبت کی داستان سناتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے موئے مبارک اور نقشِ قدم کا تذکرہ

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار میں نبی کریم ﷺ کے مبارک بالوں اور قدم مبارک کے نشان کی زیارت استنبول میں مسلمانوں کے لیے بہت برکت کی جگہ ہے۔ حضور ﷺ کی داڑھی مبارک کے بال بہت احترام کے ساتھ شیشے کے برتنوں میں محفوظ کیے گئے ہیں جن میں سے زیادہ ترٹوپ کاپی محل میں ہیں لیکن ایوب سلطان کے مزار میں بھی عقیدت کی نشانی کے طور پر کبھی کبھار خاص دنوں میں زیارت کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ مزار میں ایک پتھر پر نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک کا نشان بھی موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ سخت پتھر پر حضور ﷺ کا قدم موم کی طرح نرم لگتا تھا اور اس پر نشان باقی رہ جاتا تھا۔ عثمانی سلاطین نے

ان تبرکات کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھا اور مزار میں ان کے لیے ایسی جگہ بنائی ہے کہ ہر زیارت کرنے والا انہیں دیکھ کر دل کا سکون حاصل کرتا ہے اور اپنے نبی ﷺ کے ساتھ اس کی محبت کا رشتہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

مزار کے صحن میں چنار کا بڑا درخت

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار کے صحن میں چنار کا وہ بڑا درخت عقیدت اور تاریخ کی ایک عجیب نشانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ درخت سلطان محمد فاتح کے پیر اور استاد حضرت آق شمس الدین نے مزار کی جگہ دریافت کرنے کے وقت خود لگایا تھا۔ اس درخت پر ایک تختی بھی لگی ہوئی ہے جس پر اس درخت کی قدیم تاریخ مزار کی تعمیر کا وقت جو تقریباً 1458 عیسوی بنتا ہے اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے بلند مقام کی شان میں دعا کے بہت خوبصورت کلمات لکھے گئے ہیں۔ اس درخت کے گرد لگی کتبوں پر نبی کریم ﷺ کی وہ مبارک حدیث بھی بہت شان سے لکھی گئی ہے

جس میں قسطنطنیہ کی فتح اور اس کے لشکر کی بشارت دی گئی ہے۔ مزار کی زیارت اور جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ یہاں سے تھوڑا آگے ایک پہاڑی ہے جو پیر لوٹی Pierre Loti پہاڑی کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کی سیر کا اپنا ہی مزہ ہے۔ آیئے کہ اب میں آپ کو اپنے ساتھ پیر لوٹی پہاڑی کی سیر پر لے چلوں۔

پیئر لوٹی کی پہاڑی

مزار سے تھوڑا اوپر ایک پہاڑی ہے جس پر لوگ ٹیلی فیرک کیبل کار میں چڑھتے ہیں۔ وہاں کے لیے سیڑھیاں بھی موجود ہیں لیکن وہ بہت زیادہ اور لمبی ہیں۔ اس جگہ سے استنبول کے سمندر کا بہت خوبصورت نظارہ ہوتا ہے۔ اس مقام سے استنبول مکمل طور پر ایسا صاف نظر آتا ہے جیسے ہاتھ کی ہتھیلی۔ وہاں ایک مشہور کیفے بھی ہے جہاں لوگ چائے اور قہوہ پیتے ہیں۔

تاریخی قبرستان

مزار کے گرد و نواح میں اور پہاڑی پر چڑھنے کے راستے میں بہت سے تاریخی قبرستان ہیں۔ وہاں عثمانی سلطنت کے دور کے بڑے بڑے وزراء علماء اور مشہور لوگوں کی قبریں ہیں جن کے کتبے بہت فنی انداز میں بنائے گئے ہیں۔ قبرستان سے یاد آیا کہ استنبول میں افغانوں افغانستان کے پختونوں کا بھی ایک مشہور قبرستان موجود ہے جس کی تاریخ عثمانی سلطنت تک پہنچتی ہے۔آیئے کہ اس کی تاریخ پر روشنی ڈالیں تاکہ ہر علاقے کا افغان اپنے عظمت تاریخ اور شجرے سے باخبر ہو سکے کیونکہ یہ نہ صرف افغانستان بلکہ دنیا کے تمام افغانوں کے لیے ---خواہ وہ پاکستان میں ہوں ہندوستان میں ہوں یا دنیا کے دیگر کونوں میں ہوں--- ایک اعزاز اور فخر کی بات ہے۔

استنبول میں افغانوں پشتونوں کا قبرستان

استنبول کے علاقے اسکودار Uskudar میں افغانوں کی ایک بہت پرانی خانقاہ موجود ہے جس کی تاریخ عثمانی خلافت کے دور تک پہنچتی ہے۔اس خانقاہ کے ساتھ ایک تاریخی قبرستان بھی ہے جس میں ان افغانوں کی قبریں ہیں جو سینکڑوں سال پہلے یہاں رہتے تھے یا یہاں وفات پائے تھے۔ان قبروں کے کتبوں پر ان کے نام اور یہ کہ وہ افغانستان کے کس صوبے یا علاقے سے تعلق رکھتے تھے یہ بھی لکھا ہوا ہے۔یہ جگہ نہ صرف ایک قبرستان ہے بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ افغانوں اور عثمانی ترکوں کے درمیان سینکڑوں سالوں سے کتنا مضبوط مذہبی اور ثقافتی رشتہ تھا۔

یہ بات بالکل واضح اور سچ ہے کہ افغانوں نے مشکل وقت میں عثمانی خلافت کی بھرپور حمایت کی تھی۔جب انیسویں صدی کے آخر میں روس اور عثمانیوں کے درمیان جنگیں جاری تھیں تو افغانستان سے ہزاروں مجاہدین رضاکارانہ طور پر

استنبول پہنچے تھے تاکہ خلیفہ اور مرکزِ اسلام کا دفاع کر سکیں۔ مشہور تاریخی روایات کہتی ہیں کہ ان افغانوں نے محاذوں پر اتنی بہادری سے جنگ لڑی تھی کہ عثمانی سلطان اور فوجی سربراہ انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ استنبول میں ان مجاہدین اور مسافروں کے لیے افغان خانقاہ افغان تکیہ بنائی گئی تاکہ انہیں عزت اور پناہ دی جا سکے۔ حتیٰ کہ پہلی جنگِ عظیم میں بھی سرحدی علاقوں کے افغانوں اور ہندوستان کے مسلمانوں نے عثمانیوں کے لیے مالی اور جانی قربانیاں دیں کیونکہ وہ خلافت کو پوری امت کا مشترکہ گھر سمجھتے تھے۔

افغانوں اور عثمانیوں کا رشتہ بہت قدیم تھا لیکن غازی امان اللہ خان کے دور میں یہ تعلقات مزید شہرت تک پہنچ گئے۔ جب ترکی میں خلافت کا نظام ختم ہوا اور مصطفیٰ کمال اتاترک نے جدید ترکی کی بنیاد رکھی تو غازی امان اللہ خان ان اولین سربراہوں میں سے تھے جنہوں نے ترکی کے ساتھ بھائی چارے کا ہاتھ بڑھایا۔ امان اللہ خان ترکی سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ افغانستان بھی

ان کی طرح ترقی کرے اسی لیے انہوں نے ترکی سے ڈاکٹر اساتذہ اور فوجی ماہرین کابل بلائے تاکہ افغانستان کی فوج اور نظام کی تعمیر میں مدد کر سکیں۔

اب واپس اپنے سفر نامے کی اصل روح اور سیر کے باقی حصے کی طرف لوٹتا ہوں۔ پہاڑی کی سیر کے بعد ہم واپس کبوتروں کو دیکھنے آئے جہاں ہزاروں کبوتر ہوتے ہیں یہ منظر بہت زبردست اور روح کو تسکین دینے والا منظر تھا۔لوگ کہتے ہیں کہ یہ کبوتر مزار کی برکت کی وجہ سے یہاں رہتے ہیں۔ عثمانی سلاطین اور عام مسلمانوں نے ہمیشہ ان کبوتروں کا بہت خیال رکھا۔بہت سے لوگ جو مزار پر جاتے ہیں وہ یہ بات کرتے ہیں کہ یہ کبوتر بہت نظم و ضبط میں ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ یہ کبوتر مزار کے گنبد سے اوپر نہیں اڑتے یعنی مزار کے اوپر بے ادبی نہیں کرتے اور اپنا ایک خاص حد ادب برقرار رکھتے ہیں۔ یہ عام کبوتروں کی طرح ہی نظر آتے ہیں لیکن مزار کے صحن میں ان کی اتنی زیادہ تعداد اور لوگوں کے ساتھ ان کا انس ایک الگ ہی احساس دیتا ہے۔ وہاں لوگ ثواب کی نیت سے انہیں دانہ ڈالنے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔مزار کے باہر ایک

بہت خوبصورت بازار ہے جس میں تسبیح عطر تاریخی انگوٹھیاں کپڑے اور ترکی کی مشہور مٹھائی ملتی ہے۔ بازار میں سیر اور تھوڑی خریداری کے بعد ہم بہت زیادہ تھک چکے تھے۔

قریب ہی موجود ہوٹل میں ہم نے کھانا کھایا اور چائے پی اور واپس اوتوگار بس ٹرمینل کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو نماز کا وقت تھا تمام دوستوں نے نماز ادا کی اور نماز کے بعد حضور ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگی پر باتیں کیں اور آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ انشاءاللہ کل توپ کاپی محل کی سیر کے لیے جائیں گے۔ صبح نماز اور ناشتے کے بعد ہم دوبارہ اوتوگار بس ٹرمینل کی طرف روانہ ہوئے۔ M1 میٹرو میں سوار ہونے کے بعد ہمارا پہلا ٹارگٹ ینی کاپی اسٹیشن تھا۔ ینی ترک زبان میں نئی اور کاپی دروازے کو کہتے ہیں۔ وہاں سے ہم سیر کیجی اسٹیشن پر اترے اور گل خانہ پارک کے راستے سے توپ کاپی کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ یہاں سے گاڑی بھی جاتی ہے لیکن چونکہ ہمارا مقصد سیر و تفریح تھا اس لیے گل خانہ پارک دیکھنا بھی ضروری تھا۔ یہاں

توپ کاپی اور گل خانہ پارک کے بارے میں تھوڑی معلومات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ سیر کے ساتھ ساتھ تاریخ کے سنہری لمحات سے بھی لطف اندوز ہو سکیں۔

توپ قاپی محل

توپ قاپی محل عثمانی ترکی زبان میں طوپقپو سرایی 1465ء سے لے کر 1853ء تک دارالحکومت قسطنطنیہ میں عثمانی سلاطین کی سرکاری طور پر رہائش کی جگہ تھی۔ یہ محل سرکاری امور کا مرکز تھا اور آج کل ایک میوزیم کی شکل میں استنبول کے بڑے سیاحتی مقامات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس محل کی تعمیر کا کام 1459ء میں سلطان محمد فاتح کے حکم پر شروع ہوا۔ یہ محل 4 مرکزی صحنوں اور بہت سی چھوٹی عمارتوں کے مجموعے پر مشتمل ہے۔ اپنے عروج کے وقت میں یہاں 4000 سے زائد افراد زندگی بسر کرتے تھے۔

روایات بتاتی ہیں کہ سلطان محمد فاتح کے وزیرِ اعظم صبح سویرے گھر سے گھوڑے پر سوار ہوتے صبح کی نماز ایا صوفیہ میں ادا کرتے اور پھر شاہی محل میں بادشاہ کی سلامی کے لیے جاتے۔ اس کے بعد وہ محل کے دیوانِ خاص میں امیروں سفیروں اور سلطنت کے اہم افراد سے ملاقات کرتے اور فیصلے کرتے تھے۔ ان مشوروں کے وقت سلطان ایک جالی دار کھڑکی سے یہ تمام کارروائی دیکھتے اور سنتے تھے اور جب کبھی مداخلت کی ضرورت ہوتی تو وہیں سے اپنا فیصلہ سنا دیتے۔ اس محل میں ہزاروں کمرے ہیں جن کے صرف اہم حصوں تک ہی عام لوگ جا سکتے ہیں۔ وزارتِ دفاع کے اہلکار اور ترکی کی پولیس اس کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ محل عثمانی فنِ تعمیر کی ایک عظیم مثال ہے جس میں اس وقت کے برتن کپڑے اسلحہ ڈھالیں فن پارہ خطاطی کے نمونے اور عثمانی خزانے اور زیورات نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

باسفورس کے سمندر کے کنارے واقع یہ میوزیم ایک وقت میں ترک سلاطین کی رہائش گاہ اور دیوانِ خاص تھا۔ اس کے اصل دروازے پر توپیں لگی ہوئی

تھیں اسی لیے یہ توپ قاپی یعنی توپوں والے دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔ بہت سے دوست جو پشتو میں اس کا نام توپ کاپی لکھتے ہیں وہ غلط ہے عثمانی ترکی زبان میں دروازے کو قاپی کہا جاتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے توپ قاپی کہا جائے۔اس کی ایک مثال اصفہان میں عالی قاپو محل ہے جس کا نام ترکی زبان میں ہے۔اس کے بعد پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے سلطان سلیمان خان بھی اسی محل میں پروان چڑھے بڑے ہوئے اور اپنی بہت سی فتوحات کا جشن بھی یہیں منایا۔

بابِ ہمایوں

اس محل کی بنیاد رومی سلطنت کے دور میں تیسری صدی میں رکھی گئی تھی۔ سن 1453 میں جب ترکوں نے استنبول فتح کیا تو یہ محل سلطان محمد فاتح کی سرکاری رہائش گاہ بن گیا۔ کئی صدیوں تک ترک سلاطین اس محل کو رہنے کے لیے استعمال کرتے رہے۔ سن 1453 میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد

فاتح نے قسطنطنیہ کے پرانے شاہی محل کے کھنڈرات تلاش کیے۔ اس جگہ عثمانی دربار نے اسکی سرای یعنی پرانے محل کی تعمیر کا حکم دیا جو آج کل استنبول یونیورسٹی کا حصہ ہے۔ سلطان نے ایک بہتر علاقے کی تلاش کے بعد سن 1459 میں توپ قاپی کے موجودہ مقام پر محل کی تعمیر کا حکم دیا۔ شروع میں یہ ینی سرای یعنی نئے محل کے نام سے مشہور تھا اور توپ قاپی کا نام اسے انیسویں صدی میں دیا گیا۔ سلطان نے اس محل کی تعمیر کے لیے مختلف علاقوں سے ماہرین اور کاریگر بلائے جنہوں نے اس وقت کا قیمتی اور نایاب مٹیریل تعمیراتی سامان اس میں استعمال کیا۔ جب کمال اتاترک نے خلافت ختم کی اور نئ جمہوری ترکی کی بنیاد رکھی تو سن 1924 میں یہ محل میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا اور اب اس کے دروازے ہر کسی کے لیے کھلے ہیں۔

باب السلام

محل کے جنوبی اور مغربی طرف ایک بہت بڑا شاہی باغ بھی بنایا گیا ہے جسے گل خانہ باغ کہا جاتا ہے۔ اس محل میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں جن کے مرکزی دروازے کو بابِ ہمایوں یا بابِ سلطنت کہا جاتا ہے۔ یہ بڑا دروازہ پہلی بار سن 1478 میں تعمیر کیا گیا تھا لیکن انیسویں صدی میں اسے دوبارہ سنگِ مرمر سے بنایا گیا۔ اس دروازے پر قرآن کریم کی آیات اور مختلف سلاطین کی خطاطی لگی ہوئی ہے۔ یہ دروازہ صبح سے لے کر عشاء تک کھلا رہتا تھا۔ وزراء اور دیگر معتبر شخصیات کے علاوہ کسی اور کو اس دروازے سے گزرنے کی اجازت نہ تھی۔

دوسرا دروازہ باب السلام ہے جس کے دونوں طرف دو برج ہیں اور یہ سلطان سلیمان قانونی نے 16ویں صدی میں بنوائے تھے۔ اس دروازے سے گزرنے کی اجازت صرف سلطان کو تھی۔ تیسرے دروازے کا نام باب السعادہ

تھا جو 15 ویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا اور یہ محل کے مکینوں کے آنے جانے کے لیے تھا۔ اس دروازے سے گزرنے کے لیے سلطان کی خاص اجازت درکار ہوتی تھی یہاں تک کہ صدرِ اعظم وزیرِ اعظم کو بھی صرف خاص دنوں میں گزرنے کی اجازت تھی۔ سلطان عیدوں اور تقریبات میں یہ دروازہ اور دیوان کا میدان استعمال کرتے تھے اور سلطان کی نمازِ جنازہ بھی اسی دروازے کے سامنے ادا کی جاتی تھی۔

محل میں بہت سے صحن ہیں جیسے اعلیٰ میدان دیوان میدان اندرون میدان اور صوفہ ہمایوں۔ محل کی عمارت سینکڑوں ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں سلطان کی ذاتی رہائش گاہ محل سرا ہے جس کے آرام دہ کمروں میں سلطان کی فیملی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ حرم سرا کی عمارت ہے جہاں لونڈیاں وغیرہ رہتی تھیں۔ محل سرا کی حفاظت کے لیے خواجہ سراؤں کے کمرے تھے جن کے پاس سے گزرنے کے بعد ہی محل سرا میں داخل ہونا ممکن تھا۔ مختلف جگہوں پر بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں اور کچھ عمارتیں ایسی بنائی گئی ہیں جہاں سے

سمندر نظر آتا ہے۔ایک بڑے صحن میں تیراکی کا حوض پول ہے جس کی پیمائش ایک اولمپک پول سے بھی بڑی ہے یہاں سلطان اپنی کنیزوں اور لونڈیوں کے ساتھ وقت گزارتے تھے۔

دیوانِ ہمایوں

دیوانِ ہمایوں 15 ویں صدی میں سلطان سلیمان قانونی کے حکم پر تعمیر کیا گیا۔ یہاں ریاست کے سیاسی انتظامی اور مذہبی امور اور عوام کے اہم مسائل پر گفتگو کی جاتی تھی۔ یہ اجلاس ہفتے میں 4 بار منعقد ہوتے تھے جس میں صدرِ اعظم اور اناطولیہ ورومیلیا کے قاضی شرکت کرتے تھے۔ یہاں قاضیوں کے فیصلے بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھار شیخ الاسلام بھی ان میں شرکت کرتے تھے۔ 18 ویں صدی میں سرکاری اداروں کی بابِ عالی منتقلی کے ساتھ ہی دیوانِ ہمایوں کی اہمیت کم ہو گئی۔

دیوانِ ہمایوں اور حرم کے درمیان عدالت برج ٹاور آف جسٹس واقع ہے جو محل کی سب سے اونچی عمارت ہے اور باسفورس سے نظر آتی ہے۔ اسی طرح محل میں دو لائبریریاں اندرون کتب خانہ اور احمد ثالث کتب خانہ بھی موجود ہیں۔

مقدس نوادرات مقدس امانات

میوزیم کا سب سے مشہور حصہ وہ کمرہ ہے جس میں نوادرات موجود ہیں۔ اس میں سب سے اہم اسلام کے ابتدائی دور کے مقدس نوادرات ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کی پگڑی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا عصائے مبارک رسول اللہ ﷺ کی پگڑی تلوارِ مبارک دندانِ مبارک اور داڑھی مبارک کے بال۔ حضور ﷺ کا جبہ چوغہ تیر و کمان مہرِ مبارک اور قدمِ مبارک کا نشان بھی وہاں موجود ہے۔ ایک دوسرے حصے میں خلفاء راشدین کی تلواریں رکھی گئی ہیں۔ اس کمرے کے احترام کی وجہ سے سلطان اور ان کی فیملی کو بھی سال

میں صرف ایک بار 15 رمضان کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ یہاں تصویریں لینا منع ہے۔

مصر کی فتح 17-1516 کے بعد بہت سے نوادرات وہاں سے استنبول لائے گئے۔ محل کے باورچی خانے کا ذکر بھی ضروری ہے جہاں ایک ہی وقت میں 4000 چار ہزار افراد کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا اور وہاں کے اسٹاف کی تعداد 800 سے زیادہ تھی۔

موجودہ حالت اور قلبی کیفیت

سن 1853 میں سلطان عبدالمجید اول نے اپنی رہائش گاہ دولما باغچہ محل میں منتقل کرلی۔ عثمانی سلطنت کے خاتمے کے بعد 3 اپریل 1924 کو اس محل کو سرکاری طور پر ایک میوزیم میں تبدیل کردیا گیا جو اب ترکی کی وزارتِ ثقافت وسیاحت کے کنٹرول میں ہے۔

تاریخ کے لمحات کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم واپس اپنی پچھلی باتوں کی طرف لوٹتے ہیں اور سفر نامے کا باقی ماندہ حصہ کاغذ پر نقش کرتے ہیں۔ جب ہم توپ قاپی میوزیم کے اندر داخل ہوئے تو وہاں سکون اور اطمینان کی ایک ایسی نئی ہوا لہر تھی جس نے ہمارے دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

یہاں ہم نے فی کس 40 لیرے Lira کا ٹکٹ مزار میں داخل ہونے کے لیے خریدا۔ جب ہم پہلے دروازے سے داخل ہوئے تو محل کے پہلے صحن میں ایک بڑا باغ تھا لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ وہ گل خانہ باغ نہیں ہے جس کا ذکر میں نے پہلے کیا تھا۔ یہ ایک نیا باغ ہے جسے جدید ترکی میں بنایا گیا ہے وہ پرانا باغ اب محل کے حصے سے باہر ہے اور عام لوگوں کے لیے پارک کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ باغ سے گزرنے کے بعد دائیں جانب پرانا حرم اور بائیں جانب ایا ایرین Hagia Irene کا تاریخی چرچ کلیسا واقع ہے۔

ایاایرین چرچ کلیسا

یہ مسجد نہیں ہے ایاصوفیہ کے برعکس ایاایرین کو کبھی بھی مسجد میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ عثمانیوں نے اس عمارت کو اسلحہ ڈپو کے طور پر استعمال کیا اسی لیے اس نے آج بھی اپنی اصل تاریخی ہیئت اور صلیب Cross کے نشانات برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ استنبول میں پہلی کلیسا تھی جو بازنطینی سلطنت کے وقت میں تعمیر کی گئی تھی۔ موجودہ ایاصوفیہ کی عمارت سے یہ کلیسا تقریباً دو سو سال پرانی ہے۔ اس عمارت کا صوتی نظام Sound System بہت مشہور ہے اس کے گنبد کی تعمیر ایسی ہے کہ آواز اس میں دلکش انداز میں گونجتی ہے۔ آج کل یہاں دنیا کی مشہور کلاسیکی موسیقی کے کنسرٹس منعقد ہوتے ہیں۔

ہمارا مقصد چونکہ مقدس نوادرات کی زیارت کرنا تھا نہ کہ کلیسا دیکھنا اس لیے ہم نے چرچ دیکھنے کا ٹکٹ نہیں خریدا صرف حرم اور میوزیم عجائب گھر کے

ٹکٹ لیے۔اب یہاں میں حرم کی تاریخ پر اپنے قلم کو تھوڑی زحمت دوں گا تاکہ حرم کی تاریخ سے وقت کی گرد ہٹ سکے۔

حرم

حرم میں سلطان کی فیملی کی ذاتی زندگی گزرتی تھی اور یہ محل کا سب سے پوشیدہ اور دلچسپ حصہ ہے۔ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ حرم صرف رہنے کی جگہ تھی لیکن اصل میں یہ ایک بہت منظم ڈسپلن یافتہ تعلیمی اور انتظامی مرکز بھی تھا۔ یہاں حرم میں دیکھنے اور سمجھنے کے اہم حصے درج ذیل ہیں

سلطان کی والدہ کا کمرہ Valide Sultan Suite حرم کی سب سے بااختیار خاتون سلطان کی والدہ ہوتی تھی۔ان کا گھر کمرہ پورے حرم کے مرکز میں واقع ہے اور اسے بہت خوبصورت نقاشی اور سونے سے سجایا گیا ہے۔ حرم کے تمام معاملات وہی کنڑول کرتی تھیں۔

خرم سلطان کا کمرہ خرم سلطان جو یورپ میں روکسلانا کے نام سے مشہور تھیں عثمانی سلطنت کی تاریخ میں سب سے زیادہ طاقتور خاتون تھیں۔ وہ اصل میں یوکرین سے تعلق رکھتی تھیں جنہیں ایک کنیز کے طور پر حرم لایا گیا تھا لیکن اپنی ذہانت اور حسن کی وجہ سے انہوں نے سلطان سلیمان قانونی کا دل جیت لیا۔ پرانی رسموں کے خلاف سلطان نے ان کے ساتھ قانونی طریقے سے نکاح کیا اور انہیں سلطانہ کا لقب دیا۔ انہوں نے نہ صرف حرم کا نظام بدلا بلکہ پہلی بار سلطان کے اصل محل توپ قاپی میں رہنے کی اجازت حاصل کی اور حکومتی و سیاسی کاموں میں بھی براہِ راست کردار ادا کیا جسے تاریخ میں خواتین کی سلطنت Sultanate of Women کے دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خرم سلطان سیاست کے ساتھ ساتھ نیکی کے کاموں میں بھی پیش پیش تھیں اور انہوں نے استنبول مکہ اور مدینہ میں بہت سی مسجدیں ہسپتال اور غریبوں کے لیے لنگر خانے تعمیر کروائے۔ آخر کار سن 1558 میں ان کا انتقال ہوا اور

انہیں سلطان سلیمان کی مسجد سلیمانیہ کے صحن میں ایک خاص مقبرے میں دفن کیا گیا۔

خرم سلطان کے کمرے میں اس وقت کی بہترین فنِ تعمیر آرکیٹیکچر کا استعمال کیا گیا ہے۔ دیواروں اور چھتوں پر سونے اور چاندی کا کام ہوا ہے۔ کمرے میں آگ جلانے کی ایک بڑی اور خوبصورت جگہ آتش دان بھی ہے جسے بہت باریک نقاشی سے سجایا گیا ہے۔ ان کے کمرے کی کھڑکیوں سے سمندر کا خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ خرم سلطان وہ پہلی خاتون تھیں جنہوں نے حرم کو سلطان کی رہائش گاہ اصل محل میں منتقل کرنے کی اجازت حاصل کی کیونکہ ان سے پہلے حرم اصل محل سے ذرا دور ہوا کرتا تھا۔ خرم سلطان کا کمرہ سلطان کی والدہ کے کمرے کے قریب ہے وہ اس لیے کہ وہ اقتدار کے مرکز کے قریب رہنا چاہتی تھیں۔ ان کا کمرہ بہت ہی خوبصورت اور قیمتی ایزنک ٹائلوں Iznik Tiles سے بنا ہوا ہے جو اس زمانے میں دولت اور طاقت کی نشانی سمجھی جاتی تھیں۔

سلطان سلیمان اور مراد ثالث کے کمرے

حرم میں سلاطین کے خاص کمرے ہیں جو عثمانی فنِ تعمیر کا شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ خاص طور پر سلطان مراد ثالث کا کمرہ جسے معمار سنان پاشا نے تعمیر کیا تھا اس کے رنگین شیشے اور پانی کا فوارہ بہت مشہور ہے۔

باندیوں اور کنیزوں کی جگہ یہاں وہ لڑکیاں رہتی تھیں جو مختلف ملکوں سے لائی گئی تھیں۔ انہیں یہاں مذہب ادب موسیقی اور دربار کے اصول سکھائے جاتے تھے۔ ان کے رہنے کی جگہیں سلطان کے کمروں کے مقابلے میں سادہ ہیں۔

خواجہ سراؤں کا صحن حرم کے دروازے پر ان خواجہ سراؤں کے کمرے ہیں جو حرم کی حفاظت کرتے تھے۔ یہ حبشی محافظ تھے جنہیں صرف یہ اجازت تھی کہ حرم کے اندر آجا سکیں اور بیرونی دنیا اور حرم کے درمیان رابطہ برقرار رکھ سکیں۔

حماموں کا سلسلہ

حرم میں خوبصورت شاہی حمام موجود ہیں جو سنگِ مرمر سے بنے ہوئے ہیں۔ سلطان اوران کی فیملی کے لیے الگ الگ حمام تھے جن میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا باقاعدہ سسٹم موجود تھا۔ حرم کے مکمل چکر کے بعد ہم تیسرے صحن میں داخل ہوئے جہاں تین اہم جگہیں ہیں مقدس نوادرات شاہی خزانہ اور احمد ثالث لائبریری۔

مقدس آثار کا کمرہ

یہ کمرہ توپ قاپی محل کا سب سے معتبر اور قابلِ احترام حصہ ہے۔ یہاں وہ نوادرات محفوظ ہیں جو عثمانی سلاطین نے صدیوں پہلے مکہ مدینہ بغداد اور قاہرہ سے جمع کیے تھے۔ یہاں ان اہم نوادرات کی ایک فہرست دی جارہی ہے جو آپ وہاں دیکھ سکتے ہیں

رسول اللہ ﷺ سے منسوب آثار

- **قمیصِ مبارک** یہ نبی کریم ﷺ کی وہ قمیص ہے جو انہوں نے خود زیبِ تن فرمائی تھی۔ اسے ایک خاص صندوق میں رکھا گیا ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک کے بال موئے مبارک۔
- وہ دندانِ مبارک جو غزوہ احد میں شہید ہوا تھا۔
- رسول اللہ ﷺ کی تلوار اور وہ کمان جو آپ ﷺ غزوات میں استعمال فرماتے تھے۔
- رسول اللہ ﷺ کے قدم مبارک کا نشان جو پتھر پر نقش ہے۔
- وہ مہرِ مبارک مہرِ نبوت جو خطوط اور مراسلوں پر لگائی جاتی تھی۔

دیگر انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار

دیگر انبیاء علیہم السلام کے آثار

- **حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصائے مبارک** وہ عصا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام استعمال فرماتے تھے۔
- **حضرت یوسف علیہ السلام کا پیراہن قمیص** ان کی محفوظ رہ جانے والی قمیص۔
- **حضرت داؤد علیہ السلام کی تلوار۔**
- **حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کھانا پکانے کا برتن۔**

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے آثار

- **خلفائے راشدین کی تلواریں** حضرت ابو بکر صدیق حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی تلواریں جن پر ان کے نام نقش ہیں۔

- **حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آثار** رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قمیص اور حجابِ مبارک۔

کعبہ شریف سے منسوب آثار

- کعبہ شریف کے دروازے کی پرانی چابیاں۔
- کعبہ کی چھت کا وہ قدیم سونے کا پرنالہ نابہ جس سے بارش کا پانی گرتا تھا۔
- حجرِ اسود کا وہ چاندی کا پرانا فریم جس میں حجرِ اسود نصب تھا۔

شاہی خزانہ Imperial Treasury توپ قاپی محل کا شاہی خزانہ جو تیسرے صحن میں واقع ہے دنیا کے قدیم ترین اور قیمتی ترین خزانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ محض سونا نہیں ہے بلکہ صدیوں کی تاریخ اور عثمانی سلطنت کی طاقت و عظمت کی نشانیاں ہیں۔ یہاں شاہی خزانے کی مشہور اشیاء کی تفصیل درج ہے

قاشوغی الماس SPOONMAKERS DIAMOND

یہ خزانے کا سب سے بڑا اور مشہور ہیرا ہے۔ اس کا وزن 86 قیراط ہے اور یہ دنیا میں موجود بڑے ہیروں میں سے ایک ہے۔ یہ ہیرا 49 چھوٹے ہیروں کے درمیان جڑا ہوا ہے جو اسے ایک خاص چمک عطا کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک غریب آدمی کو یہ ہیرا کوڑے کے ڈھیر سے ملا تھا اور اس نے اسے لکڑی کے 3 چمچوں قاشوغو کے بدلے بیچ دیا تھا اسی لیے اسے قاشوغی چمچ والا ہیرا کہا جاتا ہے۔

توپ قاپی خنجر

یہ خنجر عثمانی فنِ تعمیر اور ہنر کا شاہکار ہے۔ اس کے دستے میں تین بڑے زمرد جڑے ہوئے ہیں اور اس کے سرے پر ایک گھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہ خنجر سلطان محمود اول نے نادر شاہ افشار کے لیے تحفے کے طور پر تیار کروایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ ان تک پہنچتا نادر شاہ کا انتقال ہو گیا چنانچہ یہ خنجر واپس محل لایا گیا۔

سلطان کے تخت

نادر شاہی تخت جس پر سونا زمرد اور یاقوت لگے ہوئے ہیں۔ سلطان احمد اول کا تخت جو صدف اور ابنوس کی لکڑی سے بنا ہوا ہے اور اس پر نادر کام کیا گیا ہے۔ زمرد کا جھولنا پالنا جو شاہی بچوں کے لیے سونے اور جواہرات سے بنایا گیا ہے۔ شاہی تلواریں اور ڈھالیں وہ تلواریں اور ڈھالیں جو سونے اور قیمتی پتھروں سے سجائی گئی ہیں اور سلطان انہیں جنگوں یا مراسم تقریبات میں استعمال کرتے تھے۔ اس جگہ سے نکلتے وقت میرا دماغ ماضی کی تاریخ کے تمام صفحات الٹ پلٹ رہا تھا کہ کیسے کبھی یہ محل جاہ و جلال کی نشانی تھا اور ہر وقت اس میں ریل پیل چہل پہل ہوا کرتی تھی۔

کبھی یہاں رعایا کی بہتری اور اسلام کی سربلندی کے کام ہوتے تھے اور کبھی کسی کے ارمانوں پر جلادوں کے فیصلوں کا تبر کلہاڑا چلتا تھا اور انہیں خاک کا رزق بنا دیتا تھا۔ میں انہی سوچوں میں غرق تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا

اور مجھے ماضی کے گرداب سے باہر نکال لیا جب مڑ کر دیکھا تو عزیز تھا اس نے اشارہ کیا کہ ہمارا اسٹاپ آ گیا ہے۔ ہم وہاں اترے اور پیدل چلنے لگے میرے دوست جنہیں میں اس چکر کے دوران ساتھ ساتھ ہر جگہ کی تاریخ تھوڑی تھوڑی بیان کر رہا تھا بہت خوش تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ جگہیں ہم نے دس دس بار دیکھی ہیں لیکن جو مزہ آج آیا وہ بہترین تھا اور اس احساس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے وعدہ لیا کہ آئندہ انشاءاللہ ایشیا پل Bosphorus Bridge کی سیر کو جائیں گے اور وہاں کی تاریخ سناؤ گے میں نے بھی سر ہلا دیا اور سوچنے لگا کہ یہ دوست بھی تاریخ سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ جب ہم گھر آئے تو ہمارے دل ایمان سے منور تھے کیونکہ مقدس آثار کے دیدار نے روحوں کو تازہ کر دیا تھا اور ہم نے ایسا محسوس کیا جیسے وقت ہمیں اپنی گود میں لے کر ماضی کے زمانے میں لے گیا ہو اور یہ ہر منظر کسی ڈرامے یا فلم کی طرح ہماری نظر کے فریم سے گزر رہا تھا۔

اور ہمیں صحابہ اور سلاطین کی تلواروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی اور ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے ہم بھی ان غزوات اور جنگوں کا حصہ ہوں۔ تھکن کی وجہ سے بہت جلد نیند نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا اور دنیا سے بے خبر کر دیا۔

اگلی صبح جب ہم اٹھے تو اب بھی تاریخ کے اس نشے کا خمار ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ کام پر جانے کے دوران پورے راستے اور جائے کار آفس میں بھی یہی باتیں تھیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور نو مسلم سلاطین نے اسلام کی اشاعت کے لیے کتنی قربانیاں دیں اور ہمیں یہ دین کتنی پر سکون فضا میں نصیب ہوا ہے اور پھر بھی ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ اللہ ہم تمام مسلمانوں اور ہماری آنے والی نسلوں کو ایمان اور اسلام پر قائم و دائم رکھے آمین ثم آمین۔

محترم قارئین جس طرح میں نے اپنے سفر کے ہر لمحے کو کاغذ پر محفوظ کیا اسی طرح اس سفر نامے کے باقی حصوں میں ہم استنبول کے تاریخی مقامات کی سیر

سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا جائزہ بھی لیں گے تاکہ آپ کے علم میں اضافہ ہو۔ ترکی میں وقت گزارنے کے بعد یہ بات مجھ پر سورج کی طرح عیاں ہوگئی کہ محنت میں عظمت ہے اور محنت کے بغیر ترقی کا خواب دیکھنا حماقت ہے۔ ترک قوم چاہے مرد ہوں یا خواتین سب انتہائی محنت کش اور اخلاق کے پورے ہیں۔ ہر شخص عورت ہو یا مرد صبح سویرے اٹھتا ہے ہاتھ میں پورچہ ایک قسم کی ڈبل روٹی ہوتی ہے کندھے پر بیگ لٹکایا ہوتا ہے اور تیز قدموں سے اپنی جائے کار کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔

ان کی خوراک سادہ اور شفاف ہوتی ہے۔ کبھی شملہ مرچ کبھی آلو یا بینگن آگ پر رکھ کر ان کا بھرتہ بنا لیتے ہیں۔ ابلے ہوئے گندم خشک لہسن اور پراجبین ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔ زیتون شہد اور چکہ دہی کی ایک قسم کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ سلیمانی قہوہ اور سگریٹ ہر مرد و زن نوش کرتے ہیں۔

مالک جو خود کھاتا ہے وہی مزدور کو کھلاتا ہے۔ مالک مزدور کی طرح کام کرتا ہے اور یہ لوگ اپنی روایات اور رواج کے پابند ہیں۔ استنبول میں بنگلہ دیش انڈیا پاکستان افغانستان ایران امریکہ شام اور دیگر کئی ملکوں کے لوگ موجود ہیں لیکن ایران اور افغانستان کے کُردی زبان بولنے والوں کی بڑی تعداد یہاں آباد ہے۔ موجودہ وقت میں شام کے لوگ سفری دستاویزات کی پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں وہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر ترکی اور استنبول آجا سکتے ہیں۔

استنبول کی سڑکیں بہت صاف ستھری اور کشادہ ہیں اس کا میٹرو نظام دنیا کے بہترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایئرپورٹس کا نظام بھی بہترین ہے اور استنبول میں ایک بہت بڑا ایئرپورٹ ہے جس کے اندر بڑے بڑے شاپنگ مالز ہیں۔ بجلی کا نظام بہت بہترین اور زیرِ زمین ہے۔ استنبول کا کچھ حصہ پہاڑوں اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے باوجود وہاں سڑکوں اور ہریالی کا جال بچھا ہوا ہے۔ استنبول کے ساحل سیر و تفریح کے لیے بہترین منظر پیش کرتے ہیں جو رونق سے بھرپور اور پُر ہجوم ہوتے ہیں۔ سمندر میں جگہ جگہ

لانچیں کشتیاں اور بڑے بحری جہاز چلتے ہیں جو اس کے حسن کو کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔

قدر دان قارئین اب میں آپ کو ایشیا پل باسفورس برج کی سیر سے لطف اندوز کرواتا ہوں اور ساتھ ساتھ اس کی مختصر تاریخ سے بھی آگاہ کرتا ہوں۔

تاکہ کچھ نہ کچھ آپ کے ذہن کے گوشوں میں محفوظ رہ جائے۔ عید الاضحیٰ کا دوسرا دن تھا جب ہم نیند سے فارغ ہوئے تو دوستوں نے ارادہ کیا کہ آج ایشیا پل کی سیر کو چلتے ہیں۔ ہم تقریباً تین ساڑھے تین بجے اپنے گھر داؤد پاشا سے روانہ ہوئے۔ داؤد پاشا کے اڈے اوتوگار سے ایشیا پل تک تقریباً 17 یا 18 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ہم نے 400 لیرے میں ایک پرائیویٹ ٹیکسی کی جب ہم ایشیا پل پہنچے تو شفق کے رنگ بکھر رہے تھے۔ آسمان نے اپنی آغوش کو دلہن کی طرح سرخ کر رکھا تھا۔ ہم ٹیکسی سے اترے سمندر کے کنارے کا نظارہ کیا

اور ایک لانچ میں بیٹھ کر پل کی طرف سفر شروع کیا۔ قدردان قارئین اب یہاں پل کی تاریخ کے بارے میں تھوڑی گفتگو کرتے ہیں۔

ایشیائی پل باسفورس برج کی تاریخ اور اہمیت

استنبول کا یہ ایشیائی پل جسے سرکاری زبان میں 15 جولائی کے شہداء کا پل 15 July Martyrs Bridge کہا جاتا ہے محض سیمنٹ اور لوہے کا ایک راستہ نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کی وہ عجیب و غریب نشانی ہے جس نے دو بڑے براعظموں یعنی ایشیا اور یورپ کو گلے لگا رکھا ہے۔ جب انسان اس پل سے گزرتا ہے تو نیچے باسفورس کا نیلا پانی شیشے کی طرح چمکتا ہے اور چند ہی منٹوں میں انسان ایک دنیا سے دوسری دنیا میں داخل ہو جاتا ہے یہ منظر واقعی انسان کے ذہن کو تاریخ کے نشے میں خمار کر دیتا ہے۔

یہ پل 1973 میں جمہوریہ کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر تعمیر کیا گیا جس کی لمبائی تقریباً 1560 میٹر ہے اور یہ انجینئرنگ کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ انسانی

عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ رات کے وقت جب اس پل پر رنگ برنگی روشنیاں جلتی ہیں تو استنبول کا یہ پل ایسے چمکتا ہے جیسے آسمان کے ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔

یہ پل نہ صرف تجارت اور آمد ورفت کا راستہ ہے بلکہ ترکوں کی ہمت اور ان کی نئی وپرانی تاریخ کا ایک ایسا سنگم ہے جس سے ہر سال دنیا کے ہزاروں لوگ بڑے شوق سے گزرتے ہیں اور اس عظیم الشان شہر کی قدرت کا نظارہ کرتے ہیں۔ یہاں سیاحت کے لیے لوگ دنیا کے ہر کونے سے آتے ہیں۔ اور ایجنٹ بھی ترکی کا انتخاب اس لیے کرتے ہیں کہ یہ یورپ کا دروازہ ہے اور ہماری ڈونکی غیر قانونی سفر بھی اسی دروازے سے جڑی ہوئی تھی۔ سمندر کے ساحل اور ڈھلتی شام سکا°ي ما°ام سے خوب لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے گھر کا قصد کیا اور ساتھ ہی اپنی اگلی منزل نیلی مسجد یعنی سلطان احمد مسجد کی سیر کا ارادہ اور عزم کیا۔

سمندر کی لہروں کا شور اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا ٹکراؤ میں دیر تک محسوس کرتا رہا۔ استنبول کے ساتھ میری محبت اور لگاؤ بہت زیادہ ہے اور جب کبھی اللہ نے ہمت دی تو انشاءاللہ استنبول میں ایک گھر خریدوں گا یہ میرا بہت بڑاارمان ہے۔

میری سالگرہ ایک شام جب کام سے چھٹی ہوئی تو میں بہت زیادہ اداس تھا کیونکہ 6 نومبر تھی اور یہ میری سالگرہ کا دن تھا۔ وطن میں میری اہلیہ اور میرے بچے میری سالگرہ کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ چونکہ اسلامی نقطہ نظر سے یہ کوئی اچھا کام نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی تشہیر کرنا چاہتا ہوں بلکہ غم زدہ ماحول میں اپنے بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے چند لمحات لانے کا ایک بہانہ تھا۔ بہر حال میرا دل اداس تھا کہ عزیز اور دوسرے دوست عمر نے مجھ سے پوچھا کہ عادل بھائی کیوں اداس ہو؟۔ میرا مکمل نام محمد آصف عادل ہے عادل میرے والد کا لقب ہے لیکن میں نے اسکول کالج اور عام روزمرہ زندگی میں عادل کے نام سے ہی پہچان بنائی ہے۔

میں نے ایک آہ بھری اور انہیں اپنی سالگرہ کا قصہ سنایا۔ وہ خاموش ہو گیا اور پھر کہنے لگا عادل بھائی آپ اور عزیز گھر جائیں میرا تھوڑا کام ہے میں وہ نمٹا کر گھر آتا ہوں۔ ہم سب سگے بھائیوں کی طرح تھے اور ایک دوسرے کے درد و تکلیف پر دکھی ہوتے تھے۔ راستے میں عزیز کو فون آیا اس نے بات کی اور کہا عادل اس دوسری ڈیرے بیٹھک میں ایک دوست کا نکاح ہے آؤ ذرا نئے سوٹ وغیرہ خرید لیں تاکہ کل وہاں چلیں۔ میں بہت پر جوش Excited ہو گیا کہ کیا ترک لڑکیاں پٹھانوں سے شادی کرتی ہیں؟ وہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ ہاں کیوں نہیں۔ عزیز نے جینز اور شارٹ سلیو شرٹ لی اور میں نے تھری پیس سوٹ۔ شاپنگ کے بعد ہم گھر آ گئے جس کمرے میں میں دوسرے دوستوں کے ساتھ رہتا تھا وہ بند تھا۔ تمام دوست تیار ہو چکے تھے انہوں نے کہا عادل خود کو تیار کرو وہ نکاح آج ہی ہے۔ میں نے کہا وہ تو کل تھا کہنے لگے نہیں یار عزیز سے دن غلط ہو گیا تھا۔ میں نے خود کو تیار کیا اور پوچھا یہ کمرہ کیوں بند ہے؟۔ ہمارا ایک دوست بہت غصے والا تھا کسی نے کہا وہ غصہ ہو گیا ہے اور کمرہ اندر سے لاک کر لیا

ہے۔ میں نے پوچھا باقی دوست کہاں گئے؟ کہنے لگے باہر گئے ہیں ابھی آتے ہیں۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھٹکھٹایا وہ یکدم کھل گیا اور میں گھبرا گیا۔ اسی کے ساتھ پھولوں کی پتیوں اور فوم سپرے کی بارش شروع ہو گئی اور تمام دوستوں نے ہیپی برتھ ڈے کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ حیرت کی وجہ سے میں بت بن گیا تھا پھر ہنسنے لگا کہ یہ تم لوگوں نے کیا ڈرامہ پارٹ کیا۔ یہ میری زندگی کی ایک ایسی سالگرہ تھی جسے میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ میرے دوستوں کا وہ اخلاص محبت اور قربانی قابل ستائش تھی۔

قدردان قارئین اب واپس سیر و تفریح کے سلسلے کی طرف آتے ہیں تاکہ سفر نامے کے باقی مقامات بھی دیکھیں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

عید الاضحیٰ کا تیسرا دن تھا۔ ہم داؤد پاشا کے قریب میٹرو اسٹیشن سے روانہ ہوئے اور تقریباً 20 منٹ میں نیلی مسجد پہنچ گئے۔ مسجد کے مینار دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے اور اس کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ مسجد کا بڑا

دروازہ جو لکڑی سے بنا ہوا ہے اپنی جگہ ایک شاہکار ہے۔اس دور کے کاریگروں نے اس پر اپنی مہارت کی تمام حدیں ختم کر دی ہیں۔نیلے ٹائلوں کاشی کاری کی وجہ سے ایسا منظر دکھائی دیتا ہے جیسے انسان نیلے آسمان کا نظارہ کر رہا ہو۔اب میں مسجد کے تاریخی وقار اور عظمت پر گفتگو کی طرف آتا ہوں۔

نیلی مسجد سلطان احمد مسجد کی تاریخ

یہ مسجد جو پوری دنیا میں نیلی مسجد Blue Mosque کے نام سے مشہور ہے عثمانی خلافت کے فنِ تعمیر کا ایک ایسا بے مثال شاہکار ہے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔یہ عظیم الشان مسجد سلطان احمد اول کے حکم پر 1609 اور 1616 کے درمیان تعمیر کی گئی جس کا مقصد ایا صوفیہ جیسی ایک عظیم مسجد بنانا تھا۔اس مسجد کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے چھ مینار ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ کے حرم شریف کے میناروں کی تعداد کے برابر تھے۔

جب انسان اس کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس کی اندرونی دیواریں تقریباً 21 ہزار ایسے نیلے ٹائلوں سے مزین ہیں جو ازنک Iznik tiles کے نام سے مشہور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اسے نیلی مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کا بڑا گنبد اور ارد گرد کے چھوٹے چھوٹے محراب انسان کو ایک عجیب روحانی سکون بخشتے ہیں۔ اس مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر تاریخ کی وہ عظمت اور عثمانی سلطنت کا دبدبہ ہر پتھر میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ محض ایک عبادت گاہ نہیں ہے بلکہ اسلامی ہنر اور ایک بادشاہ کے اس پختہ عزم و ارادے کی نشانی ہے جو قیامت تک اپنا نام ایک ایسی یادگار کی صورت میں چھوڑنا چاہتا تھا جسے دنیا بھر کے لوگ دیکھنے آئیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس مسجد میں نماز پڑھنے کا لطف ایسا ہے جیسے انسان تاریخ کی گود میں بیٹھا ہو۔ میں نے جب یہ مسجد دیکھی تو یقین جانیے کہ حیرت میں ڈوب گیا کہ سینکڑوں سال پہلے بھی انسانی فنِ تعمیر ترقی کے کس عروج پر تھا۔

نیلی مسجد سے باہر نکلتے ہی جب تھوڑا آگے میری نظر پڑی تو ایک اور عظیم الشان مسجد عمارت دکھائی دی۔ میں نے دوست سے پوچھا کہ کیا وہ دوسری مسجد ہے؟ اسے بھی دیکھتے ہیں۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو ایک ترجمان گائیڈ نے بتایا کہ یہ عمارت پہلے ایک چرچ تھی جو ایا صوفیہ کے نام سے مشہور تھی۔ میں نے فوراً اسے گوگل کیا اور اس کی تاریخ پڑھی۔ قدردان قارئین آیئے میں آپ کو بھی یہ تاریخ سناتا ہوں تاکہ آپ بھی تاریخ کے اس سفر سے لطف اندوز ہو سکیں۔

ایا صوفیہ کی تاریخ

ایا صوفیہ محض ایک عمارت نہیں ہے بلکہ یہ پندرہ سو سالہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ داستان ہے جس میں ہر صدی کا رنگ چھپا ہوا ہے۔ یہ عظیم الشان شاہکار تقریباً 537 عیسوی میں بازنطینی سلطان جسٹینین Justinian کے حکم

پر ایک چرچ کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا جو ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک دنیا میں عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز رہا۔

لیکن جب 1453 میں سلطان محمد فاتح نے استنبول فتح کیا تو انہوں نے اس عمارت کی عظمت کو دیکھتے ہوئے اسے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اس کے مینار تعمیر کروائے گئے اور اسے اسلامی خطاطی کے خوبصورت نمونوں سے سجایا گیا۔ اس عمارت کی سب سے عجیب بات اس کا بڑا گنبد ہے جو ایسا لگتا ہے جیسے آسمان میں معلق لٹکا ہوا ہو اور اس دور کے انجینئرز اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ایاصوفیہ کو 1935 میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے دور میں میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن پھر 2020 میں ترکی کی حکومت کی جانب سے اسے دوبارہ مسجد کے طور پر کھول دیا گیا۔

جب انسان اس میں داخل ہوتا ہے تو ایک طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بی بی مریم علیہا السلام کی قدیم تصویریں Fresco دیکھتا ہے اور دوسری

طرف نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے ناموں کی بڑی بڑی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ دنیا کی وہ واحد جگہ ہے جہاں دو بڑے مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ موجود ہے۔ یہ واقعی تاریخ کا ایک ایسا مقام ہے جو ہر مسافر کو قدرت کے نظارے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اس سیر کا اثر دیر تک میرے دل پر قائم رہا۔ ہم ہر جمعہ اور ہفتہ سیر کے لیے جایا کرتے تھے اکثر گھر کے قریب ہی پارکوں کا رخ کرتے۔ استنبول میں میرا زیادہ تر وقت سلطان احمد اور داؤد پاشا کے علاقوں میں گزرا لیکن میں نے استنبول کے تقریباً تمام ہی تاریخی مقامات دیکھ لیے۔ بہت سے واقعات اب بھی ایسے ہیں جنہیں میری خیال کی پردوں سے غربت اور بے بسی کی گرد نے دھندلا دیا ہے لیکن پھر بھی میں نے اپنی طرف سے اس سفر نامے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے اور ہر قسم کی مغالطہ آمیزی اور اضافے سے خود کو بچایا ہے۔ باقی انٹرنیٹ سے لی گئی تاریخ کی بھی تحقیق کرنے کے بعد اسے بیان کیا ہے اور ساتھ میں حوالہ جات بھی استعمال کیے ہیں۔ استنبول میں میرے آخری سیر کے مقامات

گلاٹا ٹاورGalata Tower دولمہ باغچہ محل گھنٹہ گھر اور اتاترک ایئرپورٹ تھے اور ایئرپورٹ تو میں نے واپسی کی حالت میں دیکھا۔ گلاٹاٹاور کی سیر کا منصوبہ بھی ایسے بنا کہ ہم آپس میں پشاور کے گھنٹہ گھر کے بارے میں بحث کر رہے تھے کہ وہاں پیسوں کا لین دین حوالہ ہوتا ہے تو ایک دوست نے آواز دی کہ استنبول میں بھی ایک گھنٹہ گھر اور تاریخی ٹاور موجود ہے۔ بس پھر کیا تھا میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ آنے والے وقت میں ان جگھوں کی سیر کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد ہم اسنلر Esenler سے میٹرو میں سوار ہوئے۔ ترکی میں میٹرو کا خرچہ بہت کم ہے استنبول کارڈ کے نام سے کارڈ ملتا ہے جس کا ریچارج 5 لیرے سے شروع ہوتا ہے پورے اسٹاپ کا کرایہ ڈھائی لیرے اور آدھے اسٹاپ کا ڈیڑھ لیرا کٹتا ہے۔ ہم اسنلر سے ینی قاپی Yenikapıگئے پھر وہاں سے دوسری میٹرو لائن کا انتخاب کیا اور

شیشانے Şişhane اسٹیشن پر اتر گئے۔ وہاں سے تقریباً 10-15 منٹ پیدل چلنے کے بعد ہم گلاٹاٹاور پہنچ گئے۔

وہاں ہم نے 15 لیرے فی کس ٹکٹ خریدا اور تلاشی کے بعد ٹاور کے احاطے میں داخل ہوئے۔ ٹاور پر چڑھنے کے لیے لفٹ موجود تھی لیکن نیچے اترنا پیدل سیڑھیوں سے تھا۔ گلاٹاٹاور پر چڑھنے کے بعد جو منظر اور نظارہ تھا اسے الفاظ کی زبان میں بیان کرنا بہت مہارت کا کام ہے۔ ٹاور کی بلندی سے تینوں سمندروں کا نظارہ ایک ایسا منظر ہے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہاں سے گولڈن ہارن Golden Horn کا سمندر جو استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور اس کے اوپر بنے پل ایک عجیب تصویر پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف باسفورس کا پانی ہے جو ایشیا اور یورپ کو آپس میں جوڑتا ہے اور بحیرہ مرمرہ Sea of Marmara میں دور دور نظر آنے والے جزیرے ایک الگ ہی رنگ کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ٹاور کی چوٹی سے جب استنبول کو دیکھو تو لوگ اور گاڑیاں بہت چھوٹی چھوٹی دکھائی دیتی ہیں اور پورے

استنبول کا ایک الگ ہی حسین نظارہ دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ قدردان قارئین یہاں آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے گلاٹاٹاور کی مختصر تاریخ بیان کرتا ہوں۔

گلاٹاٹاور کی تاریخ

گلاٹاٹاور کی تاریخ استنبول کے ہزاروں سال کے قصے اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ پہلی بار چھٹی صدی عیسوی میں بازنطینی سلطان جسٹینین کے دور میں بنایا گیا تھا لیکن وہ ٹاور جنگوں میں تباہ ہو گیا۔ موجودہ ٹاور جو ہم دیکھتے ہیں اسے 1348 عیسوی میں جینوائیوں Genoese نے مقدس صلیب کے ٹاور کے نام سے شہر کی دفاعی دیواروں کے ایک حصے کے طور پر تعمیر کیا تھا۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ ٹاور الگ الگ کاموں کے لیے استعمال ہوتا رہا کبھی یہ قیدیوں کے لیے جیل تھا کبھی ستاروں کے مشاہدے کے لیے رصد گاہ اور عثمانی سلطنت کے وقت میں آگ لگنے کے واقعات پر نظر رکھنے واچ ٹاور کے

طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کی ایک بہت عجیب اور مشہور کہانی 17 ویں صدی کی ہے جب کہا جاتا ہے کہ ہزار فن احمد چلبی نے اسی ٹاور سے مصنوعی پروں کے ذریعے اڑان بھری اور باسفورس کے سمندر کے اوپر سے گزرتے ہوئے خود کو ایشیائی کنارے اسکیودار Üsküdar تک پہنچا دیا۔ یہ ٹاور کئی بار زلزلے اور آتش زدگی کی وجہ سے نقصان زدہ ہوا لیکن بار بار اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

اس جگہ کے بعد ہم سمندر کے کنارے کنارے دولمہ باغچہ گھنٹہ گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ استنبول شہر میں غیر قانونی لوگوں کو اس وقت تک کچھ نہیں کہا جاتا جب تک وہ کسی جرم میں ملوث نہ ہوں۔ دوسرا یہ کہ میرے دوست 6 7 سال سے استنبول میں تھے اس لیے انہیں زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی اور انہوں نے اقوام متحدہ کی طرف سے جاری کردہ قانونی مہاجر کارڈ بھی بنوا لیے تھے۔ میرا بھی کارڈ اپلائی کرنے کا ارادہ تھا لیکن اس وقت داخلہ فیس 600 ڈالر تھی جو میرے لیے بہت بڑی رقم تھی اس وقت میری تین چار مہینوں کی

تنخواہ بھی اتنی نہیں بنتی تھی۔ تاہم حکومت کی طرف سے کوئی خاص سختی بھی نہیں تھی۔

راستے میں سمندر کے کنارے کے رنگارنگ نظارے انسان کو یہ احساس دلاتے تھے کہ یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے اور ہماری زندگی کتنی مختصر دولمہ باغچہ گھنٹہ گھر پہنچنے پر چونکہ یہاں کوئی ٹکٹ نہیں تھا اس لیے ہم نے گھنٹہ گھر کا معائنہ شروع کیا۔ اس کا طرزِ تعمیر کسی شاہکار سے کم نہ تھا یہ عثمانی سلطنت کی دیگر عمارتوں کے برعکس یورپی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس پر سفید سنگِ مرمر کا خوبصورت کام ہوا ہے اور یہ چار منزلہ ہے۔ اس کے چاروں اطراف بڑی بڑی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں اور کچھ خاص قسم کی مہریں طغرے اس پر کندہ ہیں۔ قدردان قارئین اب اس گھنٹہ گھر کی مختصر تاریخ کی طرف آتے ہیں۔

یہ تاریخی گھنٹہ گھر عثمانی خلافت کے 34ویں سلطان سلطان عبدالحمید دوم کے حکم پر 1890 اور 1894 کے درمیان مشہور ارمینی معمار سرکیس بالیان نے

تعمیر کیا تھا۔ یہ گھنٹہ گھر دولمہ باغچہ محل اور دولمہ باغچہ مسجد کے درمیان ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے یہ سمندر اور سڑک دونوں طرف سے باآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس گھنٹہ گھر کی تعمیر کا اصل مقصد عثمانی سلطنت کی جدید سازی اور لوگوں کو صحیح وقت بتانا تھا۔

اس کا طرزِ تعمیر یورپ کے نیو-باروک Neo-Baroque اور ایمپائر اسٹائل کا ایک خوبصورت امتزاج ہے جو چار منزلوں پر مشتمل ہے اور اس کی اونچائی 27 میٹر ہے۔اس کے چاروں اطراف لگی ہوئی گھڑیاں مشہور فرانسیسی گھڑی ساز پال گارنیئر نے بنائی تھیں جنہیں بعد میں 1940 میں الیکٹرانک سسٹم میں تبدیل کر دیا گیا۔ گھنٹہ گھر کی دیواروں پر سلطان عبدالحمید دوم کے خاص طغرے شاہی مہریں اور پھولوں کی نقاشی عثمانی دور کے آخری فنِ لطیف کا نمونہ ہے جو آج تک استنبول کی ایک اہم تاریخی نشانی کے طور پر اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔

یہاں ہم نے زیادہ وقت نہیں گزارا کیونکہ دیر ہو رہی تھی اور ہم دولمہ باغچہ محل کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھنٹہ گھر سے اگر آپ سیدھی طرف دیکھیں تو یہ محل نظر آئے گا اس محل کی شان و شوکت اور عظمت لفظوں کی محتاج نہیں ہے۔ اس کی دیوار کا ہر پتھر اپنی جگہ ایک تاریخ ہے۔ یہ محل مکمل طور پر یورپی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے جو باسفورس کے کنارے واقع ہے۔ محل کا ہر حصہ ایک الگ دنیا ہے۔

محل کی گلکاری بناوٹ اور اسلامی نقش و نگار تعریف کے قابل بلکہ بے نظیر ہیں۔اس کے دروازے کی ساخت بہت بہترین تھی اور مرکزی دروازے کے اوپر اس وقت کے سلطان کی مہر طغرہ ثبت ہے۔ میرے پاس اس سیر کی تمام تصویریں موجود تھیں لیکن میموری کارڈ زیادہ بوجھ کی وجہ سے کرپٹ خراب ہو گیا اور تمام تصاویر و ویڈیوز ضائع ہو گئیں۔ ہم نے یہاں 90 لیرے فی کس کے حساب سے ٹکٹ خریدا۔ قدردان قارئین اب محل کے بارے میں مختصر تاریخ بیان کرتا ہوں تاکہ آپ اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

دولمہ باغچہ محل کی تاریخ

دولمہ باغچہ محل یا سرائے جو ترکی کے شہر استنبول میں واقع ہے ایک انتہائی تاریخی شاہی محل ہے جو 1853ء سے 1922ء تک عثمانی خلافت کا مرکزی ہیڈ کوارٹر رہا۔ یہ محل استنبول کے یورپی حصے میں باسفورس کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے اور یہ استنبول کا پہلا محل تھا جو یورپی طرز پر بنایا گیا۔ اس کی تعمیر کا حکم سلطان عبدالمجید اول نے دیا تھا۔ یہ محل 1842ء سے 1853ء کے درمیان 5 ملین عثمانی سونے کے پاؤنڈز جو تقریباً 35 ٹن سونا بنتا ہے کی لاگت سے تیار ہوا جس میں سے صرف 14 ٹن سونا اس کی چھتوں کی آرائش میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے مرکزی ہال میں دنیا کا سب سے بڑا کرسٹل فانوس لگا ہوا ہے جس کا وزن ساڑھے چار ٹن ہے اور یہ ملکہ وکٹوریہ نے تحفہ کیا تھا۔ یہ جگہ اصل میں باسفورس کا ایک حصہ تھی جسے 18 ویں صدی میں مٹی سے بھر دیا گیا تھا اسی لیے اسے دولمہ باغچہ بھرا ہوا باغ کہا جاتا ہے۔ یہ محل ارمینی معماروں غرابت امیرا بالیان اور ان کے بیٹے نگوگایوس بالیان نے ڈیزائن کیا تھا۔ محل میں 285

کمرے 46 دربار ہال 6 حمام اور 68 بیت الخلاء ہیں اور یہ تین حصوں مابینِ ہمایوں موابد سالون اور حرم ہمایوں میں منقسم ہے۔ آج کل یہ ایک میوزیم ہے اور جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے بھی اپنے آخری ایام یہیں گزارے اور 10 نومبر 1938ء کو اسی محل میں وفات پائی۔

قدردان قارئین اب وہ وقت آ گیا تھا جب میں اپنی واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ تقریباً ایک سال گزارنے کے بعد جب میں معاشی طور پر سیٹ ہونے ہی والا تھا میرے بڑے بھائی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا جس نے مجھے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ دوستوں کے مشورے پر میں نے خود کو رضاکارانہ طور پر ترکی کے تارکینِ وطن سینٹر ڈیپورٹیشن سینٹر کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے میری مکمل تفصیلات لیں انگلیوں کے نشانات فنگر پرنٹس لیے اور ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا کہ 15 دنوں کے اندر اپنا ٹکٹ خود خرید کر یہاں حاضر ہو جاؤ۔ میں نے اپنے شاگرد ثناء اللہ کو فون کیا جو اب جرمنی میں ہے اس نے رات دو بجے آن لائن 92000 پاکستانی روپے میں ٹکٹ خریدا اور مجھے واٹس ایپ کر

دیا۔ جب میں واپس ڈیرے پر آیا اور دوستوں کو بتایا کہ ٹکٹ مل گیا ہے تو وہ سب یکدم رو پڑے۔ سب کہنے لگے کہ جانا تو تھا ہی لیکن ٹکٹ ایک دو دن بعد لے لیتے ہم نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ ہم سب دوست خوب روئے جب دل تھوڑا ہلکا ہوا تو میں نے پیکنگ شروع کی۔ رات آٹھ بجے تک دوستوں کی ضیافتوں کے بعد ہر دوست نے کچھ نہ کچھ تحفہ تیار کر رکھا تھا۔ عزیز جو میرا بہت قریبی اور چھوٹے بھائی جیسا ہے اس نے ایک بیگ اور کچھ پیسوں کا انتظام کیا تھا۔ وہ پیسے تقریباً تین ماہ بعد میں نے یہاں اس کے بھائی کے حوالے کیے جس پر عزیز ناراض بھی ہوا کہ عادل بھائی آپ کا ہاتھ تنگ ہے مجھے ابھی ضرورت نہیں تھی میں تو یہ پیسے زندگی بھر واپس نہیں مانگتا لیکن اگر دینے ہی تھے تو کچھ وقت بعد دے دیتے۔ میں نے اسے دعا دی کہ اللہ تمہاری عزت میں اضافہ کرے اور اجر دے۔ گپ شپ کے بعد تمام دوست مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے آئے جس کا نام کمال اتاترک ایئرپورٹ تھا۔ یہاں اب اتاترک ایئرپورٹ کی مختصر تاریخ بیان کرتا ہوں۔

کمال اتاترک ایئرپورٹ کی مختصر تاریخ

یہ ایئرپورٹ 1912 میں ایک فوجی اڈے کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا اور یہ ترکی کے سب سے بڑے اور مصروف ترین ایئرپورٹس میں سے ایک تھا جسے 1980 میں مصطفٰی کمال اتاترک کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ ایئرپورٹ استنبول کے یورپی حصے میں باقرکوئے Bakırköy کے علاقے میں بحیرہ مرمرہ کے کنارے واقع ہے۔ 6 اپریل 2019 تک یہ ترکش ایئرلائنز کا مرکزی ہیڈ کوارٹر رہا لیکن مسافروں کی بے پناہ تعداد اور جگہ کی کمی کی وجہ سے تمام پروازیں استنبول کے نئے ایئرپورٹ پر منتقل کر دی گئیں۔ اب اس جگہ کا ایک بڑا حصہ ایک عظیم قومی پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور باقی ماندہ حصہ صرف سرکاری پروازوں کارگو نجی جیٹ طیاروں اور طبّی ہنگامی حالات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب انہوں نے مجھے انتظار گاہ Waiting Area میں داخل کر دیا تو تمام دوست گھر چلے گئے۔ ایئرپورٹ کے اندر ایک الگ ہی دنیا تھی بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز رنگ برنگی دکانیں اور بہت زیادہ ہجوم۔

بورڈنگ اور مکمل تلاشی و چیکنگ کے بعد ہم جہاز میں داخل ہوئے یہ ترکش ایئرلائن کا ایک بڑا ایئربس جہاز تھا اور وہاں کا ماحول بہت زبردست تھا۔ چونکہ موسم سرما تھا اس لیے انہوں نے ہر مسافر کو ہلکے نیلے رنگ کا ایک چھوٹا کمبل ایک جوڑی جرابیں نیند کے دوران آنکھوں پر باندھنے والا سلیپ ماسک کانوں کے لیے ایئر پلگز اور ایک ہینڈ فری دی جو سیٹ کی اسکرین کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

جہاز مکمل لوڈنگ کے بعد اڑان بھرنے کے لیے تیار ہوا۔ یہ میرا پہلی بار تھا کہ میں جہاز میں بیٹھا تھا۔ جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا تو گاڑی کی رفتار اور اس میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا لیکن اچانک جب جہاز کا رخ اوپر کی طرف ہوا تو اس دوران دل معمولی سا ایسے ہوا جیسے گاڑی اونچائی سے نیچے اترتے وقت محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد سفر نارمل ہو گیا دورانِ سفر ہوا کے دباؤ کی وجہ سے بار بار کان بند ہو جاتے تھے جس پر ایئر ہوسٹس تھوڑی دیر بعد سینڈوچ ٹافیاں پانی یا کولڈ ڈرنکس پیش کرتیں۔

رات کے وقت جہاز کی کھڑکی سے سفر کا نظارہ ایک عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ استنبول شہر جہاز کی کھڑکی سے ایسا دکھائی دے رہا تھا کہ میں حیران ہوں اسے بیان کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے سیاہ مخمل پر جابجا ستاروں کا کام کر رکھا ہو۔ استنبول کی سڑکوں اور پلوں کی روشنیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے روشنیوں کی ایک لڑی یورپ سے ایشیا تک پھیلی ہوئی ہو۔

مسجدوں کے مینار سمندر کا کنارہ اور رنگ برنگی روشنیاں ایسی لگ رہی تھیں جیسے آسمان کے تمام ستارے زمین پر اتر آئے ہوں۔ یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ میرا ٹکٹ براستہ افغانستان کابل تھا کیونکہ اس وقت پاکستان اور افغانستان کے ٹکٹ کی قیمت میں 46 ہزار روپے کا فرق تھا۔ دوسرا یہ کہ پاکستان میں بعض سرکاری افسران رشوت کا مطالبہ کرتے ہیں اور جو لوگ غیر قانونی طریقے سے ترکی گئے ہوں انہیں تین دن یا اس سے زیادہ جیل بھی کاٹنی پڑتی ہے۔ چنانچہ میں نے ثناءاللہ کے مشورے پر کابل کا ٹکٹ لیا۔

رات کے وقت جب جہاز ایران کی حدود سے گزر رہا تھا تو ہر طرف اندھیرا تھا بس کہیں کہیں کوئی روشنی جھلکتی تھی۔ آہستہ آہستہ روشنی پھیلنے لگی اور دن اپنی آنکھیں کھولنے لگا۔ جب جہاز افغانستان کی حدود میں داخل ہوا تو ہندوکش کے مٹیالے خاکی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

پہاڑ بہت چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اپنا نمبر انٹرنیشنل رومنگ پر لگا رکھا تھا جو دنیا کے ہر ملک میں کام کرتا ہے۔ استنبول میں میرے ایک افغانی دوست جن کا نام مدیر تھا انہوں نے مجھے اپنے والد اور بھائی کا نمبر دیا تھا۔ ان سے بات ہوئی اور انہوں نے یقین دلایا کہ انشاءاللہ کل ہم ایئرپورٹ پر آپ کے منتظر ہوں گے۔ جب جہاز نیچے اترا تو وہی گاڑی اور اونچائی سے اترنے والی کیفیت دل کا ڈوبنا محسوس ہوئی۔

کابل ایئرپورٹ پر تلاشی اور چیکنگ کا نظام بہت سادہ اور آسان تھا اور سامان کے انتظامات بھی کوئی خاص نہیں تھے۔ وہاں ایک عجیب رش اور گہما گہمی تھی ایک

مسافر کے پیچھے بیس بیس لوگ استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میرے دوست کے والد بھی انتظار کر رہے تھے جیسے ہی انہوں نے مجھے دیکھا تیزی سے میری طرف آئے اور اپنے بیٹے کو اشارہ کیا کہ مجھ سے بیگ لے لے۔ یہ وہی پہیوں والا بیگ تھا جو عزیز نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔

حال احوال اور سٹڑی مشی کے بعد انہوں نے بہت اصرار کیا کہ ہماری حجرے چلتے ہیں لیکن میں نے معذرت کی کہ گھر میں ایمر جنسی ہے بڑے بھائی کے ساتھ حادثہ ہوا ہے اس لیے مجھے جلد پہنچنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک شرط ہے میرا بیٹا تمہیں طورخم تک چھوڑنے جائے گا جب تم پاکستان کی حدود میں داخل ہو کر کال کروگے تب وہ واپس آئے گا۔ میں نے بھی انکار نہیں کیا کہ راستے کا ساتھی بھی مل جائے گا اور میں مطمئن بھی رہوں گا۔ چیکنگ اور تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد میں طورخم گیٹ سے پاکستان داخل ہو گیا اس دوست اور فون پر اس کے والد کا بہت شکریہ ادا کیا اور پشاور کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اگرچہ کوئی باقاعدہ مستند لکھاری تو نہیں ہوں لیکن یہ ایک خداداد صلاحیت ہے کہ تھوڑا بہت لکھ لیتا ہوں۔ میری تمام تر تعلیم اردو زبان میں ہوئی ہے 2005 میں مجھے اپنے کالج کی طرف سے بہترین طالب علم اور بہترین شاعر کے اعزازی سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔تاہم پشتو لکھنے کے لیے میں نے بہت محنت اور مشقت کی ہے اور یہ محنت کسی ایک دن کا حاصل نہیں بلکہ اس کے پیچھے تقریباً بیس سال کی جدوجہد ہے۔

میں چھٹی جماعت سے شاعری کر رہا ہوں جو اردو اور پشتو دونوں زبانوں پر مشتمل ہے۔ میری پشتو شاعری تقریباً تین کتابوں پر محیط ہے جبکہ اردو کی دو کتابیں ہیں جن میں سے ایک 2005 میں اور دوسری حال ہی میں اپریل 2025 میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ سفر نامہ پشتو کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی موجود ہے۔ پشتو شاعری کا مجموعہ کاڼي خنجر پتھر کا خنجر بھی اس وقت کمپوزنگ کے مراحل میں ہے اور انشاءاللہ زندگی نے وفا کی تو بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔اس کے علاوہ میں نے اپنے خالو فضل اکبر لالا کے لیے رېتیا

مینہ سچی محبت کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا تھااور رسالہ بزمِ قرآن میں بھی میری تھوڑی بہت تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔

میں نے ایک نجی اخبار میں کئی کالم بھی لکھے ہیں اور اردو و انگریزی سے تراجم کے ساتھ ساتھ افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ سب صرف چند دنوں کی بات نہیں بلکہ میری جاگی ہوئی راتوں کی محنت کا ثمر ہے۔ آج کل چونکہ اے آئی AI کا دور ہے تو بہت سے دوست ہر لکھنے والے کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن میری نظر میں اے آئی کا آنا ایک اچھا قدم ہے اس سے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہو جائے گی۔ میں اب بھی خود کو ایک ادنی طالب علم سمجھتا ہوں اور سیکھنے کے عمل میں ہوں۔ یہ سب اس لیے بیان نہیں کر رہا کہ اپنی قابلیت جتلاؤں بلکہ اس لیے کہ اس سب کے پیچھے بہت محنت اور لگن چھپی ہے۔

اب میں اپنے سفر نامے کے اختتام کی طرف آتا ہوں۔ استنبول میں ایک سال کی سخت مزدوری اور زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد جب کبھی میں سمندر کے کنارے لہروں کو دیکھتا تھا تو صرف ایک ہی خیال آتا تھا کہ زندگی کتنی انمول ہے اور ہم اسے محض چند پیسوں کے لالچ میں اتنے بڑے خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے جن دوستوں کو ایران کے پہاڑوں میں بے گورو کفن چھوڑا انہوں نے بھی میری طرح روشن مستقبل کے خواب دیکھے تھے لیکن افسوس انہیں مقتل ملا اور مجھے منزل۔

یہ میرا کمال نہیں تھا بلکہ صرف اللہ کا فضل اور ماں کی دعائیں تھیں جنہوں نے مجھے موت کے منہ سے واپس نکالا۔ میرے اس پورے سفر کا حاصل یہ ہے کہ مسافری لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے خاص طور پر وہ مسافری جس کی بنیاد غیر قانونی راستوں پر رکھی گئی ہو۔ وہاں جب کارخانے میں میں نے اپنی محنت کی پہلی کمائی ہاتھ میں لی تو میرے ذہن میں اس الی fungus لگی ہوئی

سبز روٹی کا ذائقہ آ گیا جو میں نے اپنی خودداری کی خاطر کھائی تھی۔ میں نے یہ سیکھ لیا کہ عزت پیسوں میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ انسان کسی کا محتاج نہ ہو۔

آج جب میں اپنے اس Samsung J7 Prime موبائل کو دیکھتا ہوں جو عزیز نے مجھے عسکری بازار سے خرید کر دیا تھا تو صرف دوستی اور نیکی کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ سفر نامہ یہاں ختم ہوتا ہے لیکن میرے دل میں ان ہزاروں جوانوں کا درد اب بھی تازہ ہے جو اب بھی ایجنٹوں کے جھوٹے دلاسوں پر موت کے اس راستے پر رواں دواں ہیں۔ میں نے قلم اس لیے اٹھایا ہے کہ اگر میرے اس سفر نامے سے ایک نوجوان بھی اس خونی راستے سے پیچھے ہٹ جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی کا یہ تلخ تجربہ ضائع نہیں ہوا۔

★★★

ماخذ و مراجع (حوالہ جات)

درہ آدم خیل

خان، ایم اے (2005)۔ *The Weapons of the North-West Frontier* (درہ آدم خیل کی اسلحہ سازی کی صنعت اور تاریخی پس منظر کے لیے)۔

اسپین، جے ڈبلیو (1963)۔ *The People of the Khyber* (افریدی قبائل کے رواج اور کلچری اہمیت کے لیے)۔

احمد، اے ایس (1980)۔ *Pukhtun Economy and Society* (قبائلی جرگہ سسٹم اور سماجی ڈھانچے کے مطالعہ کے لیے)۔

نیشنل ہائی وے اتھارٹی (NHA)، پاکستان (2003)۔ *"The Kohat Tunnel Project Report"* (کوہاٹ ٹنل کی سٹریٹجک اہمیت کے لیے)۔

یوسفزئی، ایچ (2018)۔ *Indigenous Gunsmiths of Dara Adam Khel* (ہاتھ سے اسلحہ بنانے کی مہارت اور تکنیک کے لیے)۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) (2019) ۔ (تعلیم اور سماجی تبدیلی کے بارے میں رپورٹ)۔

وان شہر (ترکی)

پیوٹروسکی، بی بی (1969)۔ *The Ancient Civilization of Urartu* (توشپا اور وان کے تاریخی شالید کے لیے)۔

زیمانسکی، پی ای (1998)۔ *Ancient Ararat* (وان کی 3000 سالہ قدامت کے لیے)۔

یونیسکو ورلڈ ہیریٹیج سینٹر (2016)۔ *"The Fortress of Van"* (وان قلعہ کی تاریخی اہمیت کے لیے)۔

ڈرنرسیشین، ایس (1965)۔ *Aght'amar: Church of the Holy Cross* (اکدامار جزیرہ اور ارمنی کلیسا کی تاریخ کے لیے)۔

وان یوزونجو یل یونیورسٹی (2020)۔ *Research Reports on the Van Cat* (وان کی مخصوص بلیوں کی خصوصیات کے لیے)۔

گنیز ورلڈ ریکارڈز (2014)۔ (وان کے مشہور ناشتے کے عالمی ریکارڈ کی تصدیق کے لیے)۔

ازمیر شہر

گریوز، اے ایم (2002)۔ *Miletos: A History* (ازمیر کی 8500 سالہ قدامت کی تصدیق کے لیے)۔

کیڈوکس، سی جے (1938)۔ *Ancient Smyrna: A History of the City* (ہومر اور یونانی تاریخ کے لیے)۔

اکر گل، ای (2002)۔ *The Civilizations and Ruins of Turkey* (کدیفہ کالے قلعہ کی تعمیر کے لیے)۔

کنروس، لارڈ (1964)۔ *Atatürk: The Rebirth of a Nation* (1922ء کی جنگ آزادی کے لیے)۔

گڈون، جی (1971)۔ *A History of Ottoman Architecture* (ازمیر کلاک ٹاور کے لیے)۔

استنبول میں افغانوں کی تاریخ اور قبرستان

ڈاکٹر Mehmet Saray ۔ *Afghanistan and the Ottoman Empire* (سلطان عبدالحمید اور افغان امیروں کے تعلقات کے لیے)۔

Azmi Özcan ۔ *Pan-Islamism: Indian Muslims, the Ottomans and Britain* (افغان غازیوں کی شرکت کے لیے)۔

ترک ہسٹوریکل سوسائٹی (Türk Tarih Kurumu) ۔ *The Afghan Lodge in Istanbul* (اسکودار تکیہ اور افغان قبرستان کے سرکاری ریکارڈ کے لیے)۔

اسکودار قبرستان کے کتبے : کندگیاری، کابلی اور وزیر افغان کے نام سے منسوب تاریخی قبروں کے شواہد۔

ایشیا پل / باسفورس برج

فریلی، جان(2011)۔ *The Bosphorus: An Illustrated Guide* (ایشیا و یورپ کو ملانے والے پلوں کی تاریخ کے لیے)۔

استنبول میٹروپولیٹن میونسپلٹی(IBB) ۔)پل کی تعمیر اور انجینئرنگ کے سرکاری اعداد و شمار کے لیے)۔

نیشنل ٹرانسپورٹ آرکائیوز، ترکی۔)باسفورس برج کی سٹریٹیجک اہمیت کے لیے)۔

ایاصوفیہ اور نیلی مسجد

گڈون، گاڈفرے(2003)۔ *A History of Ottoman Architecture* (عثمانی فنِ تعمیر اور سلطان احمد مسجد کے لیے)۔

بلیئر، ایس ایس، اور بلوم، جے ایم(1994)۔ *The Art and Architecture of Islam*)ازنک ٹائلز اور میناروں کی تفصیل کے لیے)۔

مین اسٹون، رولینڈ جے(1988)۔ *Hagia Sophia: Architecture and Structure*)ایاصوفیہ کی بازنطینی تعمیر کے لیے)۔

ٹوپ کاپی محل اور گلاٹا ٹاور

نیسیپو گلو، گلرو(1991)۔ *Architecture, Ceremonial, and Power* (محل کی تعمیراتی تاریخ کے لیے)۔

مولر-وینر، وولف گینگ (1977)۔ *Bildlexikon zur Topographie Istanbuls* (گلاٹا ٹاور کی تعمیر کے لیے)۔

دولمہ باغچہ محل اور کلاک ٹاور

گلرسو، سی (1990)۔ (*The Dolmabahçe Palace* محل کی تعمیر اور سونے کے استعمال کے لیے)۔

ملی سرائے (millisaraylar.gov.tr) ۔ (قومی محلات کی ویب سائٹ سے حاصل کردہ سرکاری ارقام کے لیے)۔

پاول گارنیر کلاک آرکائیوز۔ (کلاک ٹاور اور فرانسیسی گھڑیوں کی تاریخ کے لیے)۔

کمال اتاترک ایئرپورٹ

آرکائیو آف اتاترک ایئرپورٹ (IST) ۔ (ایئرپورٹ کی تاریخی اہمیت کے ریکارڈ کے لیے)۔

ایوی ایشن ہسٹری آف ترکی۔ (اتاترک ایئرپورٹ کی سروسز اور موجودہ صورتحال کے لیے)۔